رخِ سیلاب
نقّاش کاظمی
EqbalMEhdi

# عرضِ ناشر

اس وقت جبکہ کاروانِ حیات عالمی نظامِ نو کے سائے تلے اکیسویں صدی کی سرحدوں میں داخل ہو رہا ہے فکر و فن کے سیلِ رواں کا رُخ بھی متعین کرنا ضروری ہے ایسے میں نقاش کاظمی صاحب کا مجموعہ کلام "رُخِ سیلاب" شاید نئی دنیا اور پرانے نظام کے درمیان ایک روشن مستقبل کا قطب نما ثابت ہو۔ "کیا ہونا تھا جو نہیں ہوا اور کیا ہوا جو نہیں ہونا تھا" دو سادہ سے جملے ہیں جن کا جواب غالباً اس کتاب میں مل سکے۔

"رُخِ سیلاب" ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کہی گئی نظموں اور غزلوں کا سلسلے وار مجموعہ ہے جو ایک حساس روشن خیال، ترقی پسند اور انقلاب آفریں شخصیت کا آئینہ دار ہے ان میں سے چند نگارشات آپ سن بھی چکے ہونگے اور پڑھ بھی چکے ہوں گے "چاندنی اور سمندر" اور "افرو ایشیائی ادیبوں کے مسائل اور ان کا پس منظر" کے بعد یہ نقاش کاظمی صاحب کی تیسری کتاب اور دوسرا شعری مجموعہ ہے، اس مجموعہ کلام میں اکثر جگہوں پر نئی لفظیات، نئی معنیاتے، غیر مروجہ تشبیہات واستعارے نئی تراکیب، نئے اشارے کنائے اور سائنسی مسائل کو بھی جمالیات کے پرتو میں برتا گیا ہے۔ اس کتاب میں موصوف کا نظریۂ فن بڑا واضح اور صاف محسوس کیا جا سکتا ہے یعنی رومان سے انقلاب، اور مکمل انقلاب سے بنیادی آزادی، حقیقی امن اور انصاف پر مبنی فلاحی معاشرے کے قیام کے تصور کا عملی اظہار۔

امید ہے کہ آپ اس شعری مجموعہ کو شرفِ قبولیت بخشیں گے اور پسند فرمائیں گے۔

ناشر

نقّاش کاظمی

پبلشر
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم



نام کتاب ــــــــــــ رُخِ سیلاب
صنف ــــــــــــ شاعری
مصنف ــــــــــــ نقاش کاظمی
سرورق ــــــــــــ اقبال مہدی
تعداد اشاعت ــــــــــــ گیارہ سو
سالِ اشاعت ــــــــــــ اپریل ۱۹۹۲ء
مشاورت ــــــــــــ پروفیسر ممتاز حسین، حمایت علی شاعر،
ترتیب ــــــــــــ خان ظفر افغانی، گلزار فاطمہ راشدہ رضا،
طابع ــــــــــــ فضلی سنز، کراچی

ناشر
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی

قیمت :

# انتساب

خون
پسینہ
آنسوؤں
محبّتوں
اور
مشقتوں
کے
نام

انسان کا پیدا ہونا تو بہر حال مشکل امر ہوتا ہے۔ لیکن آدمی کا پیدا ہونا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تو روز ہی بے شمار پیدا ہوتے ہیں، اور وہ بھی ایک آدمی ہے۔ جو ۸، جولائی ۱۹۴۳ء* کو یو۔پی کے شہر جون پور میں سید فصیح اللہ کاظمی اور خورشید فاطمہ کے گھر پیدا ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے اور بچے دنیا میں اپنی آمد کے ساتھ ہی رونا چیخنا اور چلانا شروع کر دیتے ہیں بلکہ اپنے سرپرستوں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ کچھ یہی کام اُس نے بھی انجام دیئے ـــــ شام ہوئی تو کسی بزرگ نے کانوں میں اذان دی اور ساتھ ہی اُس کی پیدائش پر لڈوؤں کی تقسیم شروع ہوگئی کہتے ہیں کہ لڈوؤں کا ذائقہ بڑا لذیذ تھا۔ اس کے منہ میں دانت ہوتے تو وہ بھی لطف لیتا، بعد میں بہت سی رسومات انجام پائیں جن میں "چھٹی" کی رسم سب سے اہم تھی۔ اگر یہ رسم رائج نہ ہوتی تو آدمی "انسان" بننے تک کبھی "چھٹی" کا دودھ یاد نہ کرتا۔ بہر حال اُسے یہ رسم آج بھی بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں نومولود کی والدہ دلہنوں جیسا لباس زیبِ تن

---

★ بمطابق ریکارڈ (۲۶، فروری ۱۹۴۴ء)

کرتی ہے۔ گھر بھر میں مسرتوں کا سماں ہوتا ہے۔ خصوصاً ننھیال والے نئے کپڑوں، مٹھائیوں اور تحائف کے ساتھ آتے ہیں۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ پہلی بار جب اسے لکھوایا گیا تو چاندی کی دوات تھی اور چاندی ہی کا قلم تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لکھوایا گیا تھا۔ دوات میں روشنائی کی جگہ زعفران کا خوشبودار محلول بھرا ہوا تھا۔ اس طرح گویا علم وادب اور اقراء کی روشنی اسکے ننھے سے دماغ میں داخل ہوئی پھر اس روشنی کے ذریعے بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی حدود طے ہوئیں۔ وہ نواب بھی خود کو جوان سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کا اندازہ اسے قلبی وارداتوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بدخواہ کہتے ہیں کہ یہ محض اس کا واہمہ ہے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو اس نے کم عمری سے ہی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے اور جب عمر کے بیسویں سال میں داخل ہوا تو اُس کی کئی نظموں اور غزلوں کا چرچا ہونے لگا۔ خصوصاً اس کے بہت سے شعر پوسٹروں اور بینروں پر بھی استعمال کیے جانے لگے۔ مثلاً یہ شعر شاید آپ کو یاد ہو۔

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے

یہ شعر اس کی ایک غزل کا ہے جس کا مطلع یوں ہے۔

بڑھا ہے دستِ ستم آگ اچھالنے کے لیے
ہمارے خوں سے گھروں کو اُجالنے کے لیے

یہ غزل اس نے احسان دانش کی زمین میں کہی تھی وہ اگرچہ اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں اور نئے لہجے کی شاعری میں بھی ایک

مقام رکھتے ہیں۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ محنت کشوں کے لیے جو شاعری انہوں نے کی اس اعتبار سے اسے پسند ہیں۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ ایک شدید مارشل لاء کا دور تھا اور وہ ذہنی تربیت کے لیے اس غیر جمہوری اور آمریت کے دور کو سخت ناپسند کرتا تھا وہ ان دنوں مزدوروں اور کسانوں کی بہبود کے لیے کام کر رہا تھا۔ اور ٹریڈ یونین تحریک سے عملی طور پر وابستگی رکھتا تھا۔ اُن ہی دنوں اس نے یہ غزل کہی تھی اور بعض رسائل میں شائع بھی ہوئی۔ اس کے خیال میں زیرِ تذکرہ غزل کا ہر شعر اپنے اندر تاریخ کی ایک تمثیل چھپائے ہوئے ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔ ع

سنان و خنجر و شمشیر ڈھالنا ہوں گے
یہ آستیں نہیں اب سانپ پالنے کے لیے

اس طرح آپ محسوس کریں گے کہ ایک نوجوان اپنی فکر میں کس قدر پختگی کے ساتھ دوست اور دشمن کی تمیز کرتے ہوئے ایک انقلابی عمل کی جانب توجہ مبذول کرا رہا ہے۔ اس غزل کا مقطع تمام اشعار سے زیادہ طاقتور اور بھرپور ثابت ہوا جو یہ تھا۔ ع

وہ ہاتھ کاٹ دو نقاشؔ جو بڑھے ہیں ادھر
جنوں کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کے لیے !

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور وہ اپنے مخصوص طرزِ سخن اور لب و لہجہ کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران کئی اور نظموں اور غزلوں نے شہرت حاصل کی۔ جن میں "زخمِ ناخنِ گُل" اور "شکستِ حوصلۂ شب" زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ کتابیں کھولے ہوئے اور آنکھیں بند کیے"۔

اس کی شاعرانہ زندگی کا ایک اہم باب ثابت ہوئی۔ مگر اب جس شعر کا ذکر کرنا ہے اسے عوامی پذیرائی حاصل ہوئی اور ۱۹۶۹ء میں جامعہ کراچی کے ہم عصر نوجوانوں کی جانب سے "وائس آف یوتھ" کا خطاب دیا گیا۔

سروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہدِ جوانی تو کیوں ہو عمر دراز

اُس کے اِس شعر کے بارے میں لکھنے والوں نے لکھا کہ چوبیس سال کی عمر میں خواہشِ مرگ کا یہ انداز اس عہد کا المیہ ہے۔ ان اشعار کو سُن کر ایک محفل میں فیض احمد فیض نے بھی اس کی پیٹھ ٹھونکی اور ۱۹۷۰ء میں اس کے ساتھ ایک شام منائی گئی تو فیض صاحب نے ہی صدارت فرمائی۔

سروں کی فصل کے اس شعر کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنی دس سالہ ترقیاتی اسکیموں کا جشن منانا شروع کیا اور ذوالفقار علی بھٹو نے معاہدہ تاشقند کے بعد ان کی حکومت کو خیرباد کہہ دیا تو ایک دن مزدور، کسان، طالبِ علم کھلی سڑکوں پر نکل آئے پشاور سے لے کر کراچی تک کے عوام کا نہ ختم ہونے والا احتجاجی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دوران راولپنڈی پولی ٹیکنیک کالج کے چند طلبہ پر پولیس نے فائرنگ کر دی جس سے کئی طلبہ خون میں نہا گئے۔ وہ خود بھی ان دنوں طالب علموں اور مظلوم طبقہ کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا "شکستِ حوصلۂ شب" نامی نظم منظرِ عام پر آئی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ ع

یہی ہے شہرِ وفا میں دلیلِ آمدِ شب
نظارے جاں سے گئے قتل آفتاب ہوا

بدل گئی ہیں کتابیں سبق کچھ اور ہوئے
گِرا ہے جتنا لہو شاملِ نصاب ہوا

بہر حال طبقاتی جنگ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے اس نے ہمیشہ اپنی سی کاوش کی ہے اور کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ویسے تو پاکستان میں فیض، حبیب جالب، احمد فراز، حمایت علی شاعر، فہمیدہ ریاض اور بھارت میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری بھی بڑے نام ہیں۔ ان سب نے ادبی اور سماجی انقلاب میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اُس کے ذہن میں ہمیشہ میکسم گورکی اور ساحر لدھیانوی کا نام زیادہ نمایاں اور اثر انداز رہا۔ اس نے ان ہی کو پڑھ کر اپنے لڑکپن کے ادب کا رُخ ہی تبدیل نہیں کیا، بلکہ خود بھی تبدیل ہو گیا۔ عشقیہ شاعری میں بھی اس نے کبھی عامیانہ پن، بازاری انداز اور سطحی طرز کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ ایک خاص ڈھنگ سے طبع آزمائی کی جس کے لیے ایک نقاد نے کہا "واضح جانبداری اور کمٹ منٹ کا شاعر ہونے کے باوجود وہ ادبی اصطلاحوں، رویّہ اور اشاروں کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتا ہے۔ اس شاعر کو اس کے حقیقی شاعرانہ مزاج نے بیانیہ شاعری کے عذاب سے بچا لیا۔"

اُس کی شاعری کا ایک اور دور ۱۹۷۷ء سے شروع ہوا یہ ایک نئے آمرانہ دور کا آغاز تھا، اس دور میں بھی اس نے بے شمار احتجاجی نظمیں اور غزلیں کہیں اور عوام النّاس میں یہ شعر مشہور رہا۔

امیرِ شہر نے ملبوس کی تمنا میں
تمام شہر کے لوگوں کو بے لباس کیا

اسی دور میں اس کی ایک اور نظم "نیا بنجارہ نامہ" کی گونج سنائی دی ساتھ ہی "پتھراؤ"، "سر دشتِ وفا"، "لہو کا الاؤ"، "چمکیلے موسموں کا آخری منظر"، "شہرِ وفا کی قسمت میں"، "رُخِ سیلاب" اور "رسی" بھی تاریخ کے لمحات کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی مسائل پر بھی چند قابلِ مطالعہ نظمیں اس کے جنبشِ قلم سے تحریر ہوئیں۔ مثال کے طور پر "بڑی جنگ کا رجز"، "صفیں درست کرو"، "تیسری دنیا کا سورج"، "ترسی ہوئی رات کا ماتم"، "چراغ تلے"، "نمیبیا کی تحریکِ آزادی کے نام"، "ایک فلسطینی بچے کی فریاد"، "خون کا حوالہ" اور "شاخِ زیتون" وغیرہ ان نظموں کے ساتھ ساتھ غزل کا ایک اور شعر خواتین کے حوالے سے شناخت کا باعث ہوا۔

اب کے بہت رچے گا ہری مہندیوں کا رنگ
دیکھو تو اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر ——!

اس کے بعد کیا ہوا جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ایک خاتون سلطنتِ پاکستان کے ماتھے کا جھومر بنی اور ہری ہری مہندیوں کا رنگ ایسا رچا کہ دنیا بھر میں پاکستانی عورت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا لیکن جلد ہی جمہوریت کا سورج دھندلا گیا اور اس شاعر کو کہنا پڑا۔

خود اپنے دل کو جلاؤ تو کوئی بات بنے
پرائے گھر کو جلانا کوئی کمال نہیں

اس کی ذاتی اور نجی زندگی میں بھی بہت سے طوفان ایسے اٹھتے رہے جو دل و دماغ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہے۔ ظاہر ہے ایسے میں کبھی ذات کے اندر بسنے والوں سے جنگ کرنا ہوتی ہے اور کبھی وجود کے باہر

عناصر سے پھر کہتے ہیں کہ نتیجہ کے طور پر شاعری پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں دھوئیں کے لکیر، سرد راکھ، وحشت کا ایک لمحہ، کارڈیوگرام، ماں کی یاد میں، گل چہرہ کی واپسی پر، پیار کی چتا، اور اکتالیسواں دروازہ نامی نظمیں بھی قابل توجہ ہیں۔

اُس کی غزلوں کے بارے میں سوچتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی شاہراہِ حیات پر سو طرح کے شعری پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کئی خوبصورت مثالیں اشعار کی صورت میں موجود ہیں۔ جن کو جمالیات کے قدر دانوں کے علاوہ عام قاری اور سامع بھی اپنے اپنے نرم وگداز، دلوں کی گہرائیوں میں اتار لیتے ہیں۔ آخر کس کس شعر کا پس منظر بیان کیا جائے —— غرض یہ کہ اس نے غمِ حیات اور غمِ کائنات کے سنگِ گراں کو کاٹ کر اشعار کی جوئے شیر نکالی ہے اور اس کوہ کنی کے پیچھے جو ایک طویل اور روح فرسا داستان ہے وہی "رُخِ سیلاب" کی تاریخ کا اصل چہرہ ہے اور وہی کوہ کن اپنے تیشۂ قلم کے ہمراہ نقاش کاظمی کی صورت بنائے اپنے قارئین کے دربار میں حاضر ہے۔

نقّاش کاظمی
اے۔ ۵۔ ۴۰ / بلاک نمبر ۳
گلشن اقبال۔ کراچی

ترتیب

# دھوئیں کی لکیر

بجھا سکے گی نہ ذہنوں کے سُرخ انگارے
دبی ہوئی ہے جو سینوں پہ سخت برف کی سِل

جو تم نہیں ہو تو کیا ہے، جو تم ہوئے بھی تو کیا
وہی خیالوں کے رشتے وہی خلاؤں کی بات
وہی نگاہوں کی دوری وہی قرابتِ دل
وہی حیات کی نبضیں وہی شعور کی رو
وہی چراغِ تمنّا وہی دھوئیں کی لکیر

بجھی بجھی سی مگر گرم گرم آنکھوں میں
خلش کی دھوپ لیے رات کی فصیلوں سے
تھکی تھکی جو کبھی نیند اُترنے لگتی ہے
نہ جانے کیوں مجھے پھر ہچکیاں سی آتی ہیں

روایتاً میں یہی سوچتا ہوں اس کا سبب
یہی نہ ہو کہ کوئی یاد کر رہا ہو ــــــــ مگر
یقین ہی نہیں آتا کہ اس گھڑی ہر شب
مرے لیے بھی کہیں کوئی سوچتا ہوگا
کہ میری طرح کوئی خواب دیکھتا ہوگا

۱۹۷۰ء

یہ انجمن بھی عجب ہے یہ داستاں بھی عجیب
سبھی کے ایک سے چہرے، سبھی کی ایک سی بات
سبھی کے جسم صلیبانِ خونچکاں کی طرح
سروں کا بوجھ اُٹھائے بدن کا درد لیے

کہ جیسے قبر کے کتبات مرنے والوں کے
نشان و نام کے ماتم میں سخت افسردہ
تغیرات و تبدل کا شاہکار بنے
کھڑے ہوں پاؤں کے نیچے زمیں گاڑے ہوئے
کہ جیسے بوڑھے درختوں کی گیلی گیلی جڑیں
زمیں کی کوکھ سے اک آسرا لگائے ہوئے

نہ ٹوٹنے کی تمنا نہ پھوٹنے کا خیال
نہ موت و زیست کی لذت نہ آرزوئے جمال
عجیب کرب کی صورت، عجیب درد کی لے
عجیب رنگ کے نغمے عجیب طرز کی نے
سبھی کے ایک سے چہرے سبھی کی ایک سی بات

۱۹۶۹ء

# کوچۂ یار سے کچھ زخم وہ دل نے پائے

کوچۂ یار سے کچھ زخم وہ دل نے پائے
ابکے بھی موسمِ گل میں جو نہ سِلنے پائے

ایک مدت ہوئی ہم تازہ بہاروں کے رسول
ایسے بچھڑے ہیں کہ اب تک نہیں ملنے پائے

کہیئے اس فصل بہاراں کو تو پھر کیا کہیے
چند گل بھی تو سرِ شاخ نہ کھِلنے پائے

یہ بھی اک طرز کا اندازِ مسیحائی ہے
سِل گئے ہونٹ مگر زخم نہ سِلنے پائے

درد، غم، زخم، لہو، داغ، ندامت، الزام
کتنے انعامِ وفا حضرتِ دل نے پائے

صاحبِ دشتِ نوا جراُتِ گفتار کی خیر
ہونٹ پھر ہونٹ ہیں زنجیر نہ ہلنے پائے

تم نے ہر حلقۂ زنجیر میں رکھدی ہے زباں
یہ صدا سُن کے بڑے حوصلے دِل نے پائے

سنہ ۱۹۷۱ء

# شکستِ حوصلۂ شب

یہی ہے شہرِ وفا میں دلیلِ آمدِ شب
نظارے جاں سے گئے قتلِ آفتاب ہوا
بدل گئی ہیں کتابیں سبق کچھ اور ہوئے
گرا ہے جتنا لہو شاملِ نصاب ہوا

بزورِ جبر و ستم شہرِ دلبراں کی قسم
جو شہر یار تھا وہ موردِ عتاب ہوا

عجیب موسمِ گُل ہے برہنہ پا ہے بہار
دلوں میں سوگ کا عالم نظر فسردہ اُداس
نکلتے دیکھے ہیں رستوں پہ اہلِ دل کے جلوس
تھکے تھکے سے قدم اور تار تار لباس

روش روش پہ سجاؤ صداقتوں کے چراغ
جگہ جگہ سے بجھاؤ چراغ حسرت و یاس

سروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہدِ جوانی تو کیوں ہو عمر دراز
ہمیں خبر تھی کہ سڑکیں بنیں گی مقتلِ جاں
کہ تم پڑھو گے جنازوں کی غائبانہ نماز

طریقۂ طلبِ انتقام یہ تو نہیں
بدلنے ہوں گے حریفوں سے جنگ کے انداز

شکستہ حوصلۂ شب زیادہ دور نہیں
یہ کہہ رہی ہے شہیدوں کی گمشدہ آواز

صحیح ہے کہ ہر اک گُل یہاں ہے جاں بلب
مگر قبائے بہاراں کو تار تار نہ کر
غریب صبح کے کاسہ میں کچھ اُصول تو ہیں
امیرِ شب سے اجالوں کا کاروبار نہ کر

الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظامِ کارِ جہاں
تو انقلابِ زمانہ کا انتظار نہ کر

۱۹۶۸ء

# کالا سورج

اژدھے آسمانوں پر پھنکارتے پھر رہے تھے
اور زمینوں پہ
سُرخ آندھیاں چل رہی تھیں
بستیاں، بستیاں "اسمِ اعظم"
لحنِ داؤد میں پڑھ رہی تھیں

اور — پھر
میرے آنگن کے اندھے کنویں میں
دن کی سُرخی نکلنے سے پہلے
کالے سورج نے
"رنگین بدن شہر کو ڈس لیا"

۱۹۶۹ء

# ان دنوں جوشِ جنوں سے میں تو باز آیا نہ تھا

ان دنوں جوشِ جنوں سے میں تو باز آیا نہ تھا
مہرباں نامہرباں کس کس نے سمجھایا نہ تھا

رات ہم کھوئے گئے ایسے کہ لوٹ آئے تو پھر
غیر کے در پہ کھڑے تھے اپنا دروازا نہ تھا

سر پہ ہنگاموں کا سورج جسم پر وحشت کی دھوپ
سوچ کی دیوار تھی دیوار کا سایا نہ تھا

درد کی دھیمی ہوا سے آپ ٹھنڈک پڑ گئی
اس نے زخموں کی زمیں پر ابر برسایا نہ تھا

گھر پہ وہ آسیب تھا چہرے سمٹ کر رہ گئے
دور تک بستی میں اپنا کوئی ہمسایا نہ تھا

جانے کس جانب تری رنگت اُڑا کر لے گئی
خود ہوا سنکی ہوئی تھی میں نے بہکایا نہ تھا

اس لیے رشتوں کی کڑیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں
اس نے اے نقاش مجھکو ٹوٹ کر چاہا نہ تھا

سن ۱۹۷۳ء

# سردراکھ

لَٹیں کھلیں کسی کی ۔ چار سُو ہوا مہک گئی
کسی کی اوڑھنی ڈھلک گئی کہ پھول کِھل گئے
کسی کے لب کُھلے !
کہ جیسے رس ہوا میں گھولنے کے بعد
رس بھری ہوئی صدا کے
نغمے دل کو چیرتے ہوئے ۔
جگر تلک اُتر گئے

کسی کی پلکیں نیند کی شراب سے لدی ہوئی
اٹھیں کہ جیسے جھالروں کے اوٹ سے
شفق کی کرنیں۔ پھوٹ پھوٹ کر
نظر کے پتھروں پہ آ کے جم گئیں
کسی کے نرم نرم ہاتھ یوں اُٹھے
کہ جیسے شاخِ گُل ہوا کی زد پہ تھرتھرا اُٹھے
وہ نرم نرم سرخ ناخنوں کے۔ چوڑیوں کے ہاتھ
آسمانِ زلف کے سنوارنے میں لگ گئے
حسیں گدازِ جسم کی۔ "قیامتیں"
ابھارنے میں لگ گئے
میں دیکھتا رہا۔!
مری نگہ۔ مرے حواس تھے کہ جم کے رہ گئے
مرا وجود زخم خوردہ دل کی طرح تھم گیا

میں سوچتا رہا — !

کہ اس سراپا انجمن کی شمع کس طرح بنوں

کہ میں کھلی لٹوں کی خوشبوؤں میں کیسے جا بسوں

مگر نہیں - کہ میں ہوں ایک شاعرِ دلِ تباہ

یہ حسن، چاند، چاندنی - یہ پھول، آبجو - کرن

کسی سُلگتی خوشبوؤں بھری ہوئی برات میں

نجاستوں کی رنگ بھری —

نحوستوں کی تابجوشیوں کے جشن میں

نفیریوں کی کپکپاتی چیختی ہوئی اداس گونج میں

مرے نہیں - !

حویلیوں، تجوریوں - زروجواہرات کے الاؤ میں

سُلگ اُٹھے گی خود بخود — !

کہ اس کی سر درا کھ - پھر مسہریوں پہ درد رنگ

نئی نویلی چادروں پہ پھیل پھیل جائے گی

سن ۱۹۷۰ء

# پتھراؤ

شیشے کے گھر میں رہ کر جو
سب کو پتھر مار رہا ہے
اس سے کہہ دو
راہِ وفا کی چالیں اکثر
الٹی سیدھی ہوتی ہیں

یعنی جب
پتھراؤ کی سمتیں بدلیں گی
شیشے کا گھر
ریزہ ریزہ ہو جائے گا
اور اس گھر سے
پتھر پھینکنے والا بھی !

سنہ ۱۹۸۲ء

# نہ راہ و رسم نہ اندازِ دلبری لاؤ

نہ راہ و رسم نہ اندازِ دلبری لاؤ
مگر تم اپنی جگہ بھر وہی پری لاؤ

چٹخ کے ٹوٹے نہ دل سوکھی ٹہنیوں کی طرح
جو شاخِ گُل کوئی لاؤ ہری بھری لاؤ

مرا نصیب تو سوکھی زباں کا ساحل ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں سمندری لاؤ

میں رزم گاہ میں تنہا ہوں عشق کی زد پر
خیامِ حسن میں جتنے ہیں لشکری لاؤ

مزہ تو جب ہے کہ کھوٹی سماعتوں کے لیے
غزل میں بھی وہی باتیں کھری کھری لاؤ

کسی بھی تال پہ نقاش گا دامن کا گیت
جو آگ لا نہ سکو تو پیمبری لاؤ

اگست ۱۹۸۵ء

# شیشہ و سنگ

پھر کسی سوچ میں ڈوبی ہے خدا کی مخلوق
پھر کسی فکر سے بے چین، جنوں کے ہیں امام
پھر سے ہے کشمکشِ کشتی و طوفان یارو
پھر سے دُھندلانے لگے راہِ تمنّا کے چراغ
پھر سے کھانے لگے ہم تازہ بہاروں کے فریب
پھر سے اُٹھنے لگی وہ طوق و سلاسل کی صدا

پھر سے ہاں شورشِ زنجیر کی جھنکار بڑھی
پھر سے صبحوں کے امیں زینتِ زنداں ٹھہرے
پھر سویروں کے خدا ہو گئے ظلمت کے اسیر
کل جو تھے شب کے محافظ تو وہی ہیں اب بھی
دامنِ شب میں اندھیرے بھی وہی ہیں کہ جو تھے
شیشہ و سنگ جو کل تک تھے وہی آج بھی ہیں
قہقہے سوگ میں ڈوبے ہیں نہ آنکھیں مغموم
وہی ہنگامِ طرب ہے وہی نعروں کا ہجوم

سنہ ۱۹۷۰ء

# ہنوئی کی بادِ صبا

میرے چہرے پہ مٹی، دھواں اور بارود کا دیکھو غازہ

میرے ہاتھوں پہ دم توڑتا اور سسکتا ہوا دیکھو انسانیت کا جنازہ

میرے بالوں کے ہر پیچ و خم میں ہے برسوں کا افسانۂ خونِ ناحق

میرے سینے میں بھی چاہو تو جھانک کر دیکھ لو

پندرہ سالوں کی بہیمیت اور بربریت کا ہر زخم تازہ

دیکھو صحنِ فضا میں تپش کے تھپیڑے جو لُو کی طرح لگ رہے ہیں

میرے جُھلسے ہوئے جسم و جاں کی حرارت کی لہریں ہیں یہ

کوئی روکے مجھے، کوئی ٹوکے مجھے، تاکہ میں اس کو بتلا سکوں

میں ہنوئی کی بادِ صبا ہوں ________

وہ ہنوئی کہ جو ارضِ ویتنام کا پُرسکوں شہر تھا، پُرفضا شہر تھا

حشرِ ساماں ہوا خوں بداماں ہوا

آج اس شہر میں

میں نے دیکھی ہیں توپیں گرجتی ہوئی اور انگارے مُنہ سے اُگلتی ہوئی

میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے نیپام بم سے ہزاروں کی لاشیں پگھلتی ہوئی

جیسے دوزخ اس ارضِ مقدس پہ رقصاں کر رہی ہو

جیسے کوئی جہنم کا مُنہ کھول دے یا کہ آتش فشاں پھٹ پڑے

میں نے دیکھے ہیں بنجر بنائی ہوئی کھیتوں میں

میں نے دیکھے ہیں کھنڈر بنائی ہوئی بستیوں میں

سینکڑوں بے گناہوں کے لاشے

ان سے چمٹے ہوئے سامراجی گدھوں کے قبیلے

میں ہنوئی کی بادِ صبا ہوں ——————

وہ ہنوئی کہ جو ارضِ ویتنام کا پُرسکوں شہر تھا، پُرفضا شہر تھا، حشر ساماں ہے

آج اس شہر میں

اس کی جلتی ہوئی گرم گرم آگ ہی آگ کی سرزمیں پر

پابرہنہ چلی اور میں بھی چلی — پاؤں میں آبلے پڑ گئے

کل اسی شہر میں، پھر بہار آئے گی

اور میں پابرہنہ چلوں گی

ہاں! مگر سبز کھیتوں میں، باغوں میں اور جاگتی بستیوں کے جلوؤں میں

کل اسی شہر میں — صبح پھر ہو گی

خورشید ابھرے گا اور نور چھا جائے گا

جنگ اور ظلم کے خونی اور آتشیں دیوتا۔ خود ہی اپنی لگائی ہوئی آگ میں

جل کے مر جائیں گے۔ دفن ہو جائیں گے

رنگ جبروت کے آسمانوں سے چھٹ جائیں گے

اور پھر پرچمِ حریت لے کے آؤں گی۔ سب سے کہوں گی

میں ہنوئی کی بادِ صبا ہوں ———

۱۹۶۸ء

# تصویر

کبھی کبھی تو ——

میں آئینہ دیکھنے کے بجائے

ڈرائنگ روم کی تنہائیوں میں سمٹی ہوئی

تمہارے حسن کی تصویر دیکھ لیتا ہوں

# اٹھا ہے دستِ ستم آگ اچھالنے کے لیے

اُٹھا ہے دستِ ستم آگ اچھالنے کے لیے
ہمارے خوں سے گھروں کو اُجالنے کے لیے
چلو کہ وقت نے آخر ہمیں پکارا ہے
پھر انقلاب کا پرچم سنبھالنے کے لیے
وہ ہاتھ کاٹ دو یارو جو بڑھ رہے ہیں اِدھر
جُنوں کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کے لیے

بڑھا ہے ہاتھوں پہ سر کشوں کے سر کشوں کا ہجوم
نئی حیات کا سورج نکالنے کے لیے

سنان و خنجر و شمشیر ڈھالنا ہوں گے
یہ آستیں نہیں اب سانپ پالنے کے لیے

دھنک کی طرح لٹکتی ہے ظلم کی تلوار
لہو کی دھار فضا میں اُچھالنے کے لیے

پرانی فکر کے فولاد ذہن پگھلا دو
نئے نظام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے

سنہ ۱۹۷۰ء

# مرگِ نغمۂ جاں

یہ کس کا مقتلِ زنداں میں شورِ ماتم ہے
یہ کس کا حلقۂ یاراں میں نوحۂ غم ہے

یہ کون قلعۂ لاہور کی اسیری میں
متاعِ درد لیے ظلم کی امیری میں

جواں، جہانِ جفا سے گزر گیا ہے ہے
زمیں کے دل میں وہ سورج اُتر گیا ہے ہے

وہ اس صدی کے لیے روشنی کا پیغمبر
کہ اس کے خوں سے جلیں گے چراغِ حق گھر گھر

بجھا تو کتنے ستارے لرز کے ٹوٹ گئے
تمام شب کے سہارے لرز کے ٹوٹ گئے

سیاہ رو ہے وکالت کا، منصفی کا چلن
اسی کے خون سے رنگا ہے عدالتوں کا کفن

ذرا نظر تو کرو بزمِ نو بہاراں پر
سُلگ اُٹھی ہے فضا مرگِ نغمۂ جاں پر

نویدِ خونِ شہیداں، ہوئی سویروں کی
ابھی تلک تو وہی رات ہے اندھیروں کی

ہنوز حق و صداقت کی جنگ جاری ہے
ابھی تو اور حسن ناصروں کی باری ہے
(بہ یادِ حسن ناصر شہید)

# سرِشتِ وفا

دربہ درمشقِ ستم کے ابھی چرچے ہوں گے
سربہ سرموجِ فنا میں یہ رگ و پے ہوں گے

چُھپ کے بیٹھا رہے ہے توگل بدناں کی صورت
رامش و رنگ لیے لالہ رُخاں کی صورت
تربہ ترخون سے ترادامنِ دل ہے کہ نہیں

پرچمِ بزمِ صداقت تو لہو رنگ ہوا
پھر سے آغازِ جنونِ سفرِ جنگ ہوا

کل بھی ہم دیدۂ بینا سے لہو روتے تھے
آبلے آج بھی پھوٹے ہیں سرِ دشتِ وفا

آج بھی دامنِ یوسف کے لیے دستِ ہوس
یوں اٹھا ہے کہ کوئی تخت کوئی تاجِ شہی
اب کوئی زورِ عدالت نہ کوئی شورِ حرم

اب کے یوسف بھی چلا لے کے بہ شانِ دف و چنگ
اپنی جاں اپنی وفا اپنے خرابوں کا علم

سنہ ۱۹۷۰ء

# میرے لیے یہ زہر سا لہجہ نیا نہ تھا

میرے لیے یہ زہر سا لہجہ نیا نہ تھا
ہاں دوسروں نے ذائقہ ایسا چکھا نہ تھا

دستک ہوئی تو جھانک کے دیکھا ہزار بار
باہر تو کوئی تیز ہوا کے سوا نہ تھا

دن بھر کے بعد کس طرح چہرے ہوئے گلاب
میری طرح تو دھوپ میں کوئی جلا نہ تھا

کن راستوں پہ لے چلا آنکھوں کی روشنی
وہ اجنبی سا خواب جو اب تک بجھا نہ تھا

خود ہی بکھر بکھر گئے سب میرے ہمسفر
دیوار بھی نہ تھی کوئی رستہ رکا نہ تھا

اِن صورتوں میں ڈھونڈنے آیا تھا اپنا رنگ
نقّاش اس ہجوم میں کھویا ہوا نہ تھا

۱۹۷۲ء

# زمیں پر رہنے والو بولو...

زمیں پر رہنے والو سوچو زمیں کا بھی کوئی خدا ہے ؟
زمیں پر بسنے والو بولو- زمیں پر کس بشر کا حق ہے ؟

زمیں کو کس نے ازل سے اپنے لہو کی معراج بخش دی ہے
زمیں کے سینے سے کون دولت کے ڈھیر اُگاتا رہا ہے اب تک
زمیں کے چہرے کو کس نے گلشن کے رنگ و بو سے سجا دیا ہے
زمیں کو کن کی عظمتوں نے حیاتِ آدم کی روشنی دی
زمیں کو کن عظیم لوگوں نے پرچم حریت اٹھا کر
صداقت و حق و منصفی کی عظیم کرنوں سے جگمگایا

زمین پر رہنے والو سوچو !

زمین پر بسنے والو بولو !

زمین کس کے لہو کے نعروں سے گونجتی ہے ازل سے اب تک

زمین کس کے لہو کی قربانیوں کا کس کو خراج دے گی

زمین کس کو بقا کی خاطر بزرگ و برتر سمجھ رہی ہے

زمین کن قوتوں کو اپنے خدا کی صورت میں چاہتی ہے

زمین پر بسنے والو بولو !

زمیں پر رہنے والو سوچو۔ زمین کا بھی کوئی خدا ہے ؟

زمین کا بس وہی خدا ہے جو اس کو جنت نشاں بنا دے۔

زمین کا بس وہی خدا ہے زمیں پہ جو کہکشاں بنا دے

زمین کا بس وہی خدا ہے زمیں کو جو آسماں بنا دے

زمین پر رہنے والو سوچو!
زمین پر بسنے والو بولو۔ زمیں پر کس بشر کا حق ہے؟

زمین پر حق اسی کا ہے جو زمین سے تغذیہ اُگائے
زمین پر حق اسی کا ہے جو زمین سے زندگی سجائے
زمین پر حق اسی کا ہے جو زمین پر اپنا ہل چلائے

زمین پر رہنے والو بولو!
زمین پر بسنے والو بولو!

سنہ ۱۹۷۰ء

# عوامی ترانہ

محنت و قوت کا سرچشمہ
ملت و قوم و وطن کی جان

طلبہ اور مزدور کسان
طلبہ اور مزدور کسان

صحرا صحرا عہدِ خزاں میں کھلا کرینگے تازہ گلاب
ورق ورق تبدیل کریں گے روشن ہوگی زندہ کتاب
جن کے لہو سے سُرخ ہوا تھا مکتب مکتب رنگ نصاب

ملت و قوم و وطن کی جان
طلبہ اور مزدور کسان

ڈوب چلا ہے رات کا سورج ہوتے ہیں بیدار عوام

سِسک سِسک کر توڑ رہا ہے دم فرسودہ جہاں کا نظام

پگھل گئیں زنجیر کی کڑیاں رہا ہوئے ہیں جنوں کے امام

مِلت و قوم و وطن کی جان

طلبہ اور مزدور کسان

کاندھوں پہ رکھ رکھ کے کُدالیں دہقان و مزدور چلے

نئی سحر کے نغمے گاتے سرشار و مسرور چلے

غربت اور افلاس و جہالت سب دُنیا سے دور چلے

مِلت و قوم و وطن کی جان

طلبہ اور مزدور کسان

بستی بستی قریہ قریہ جوش بڑھا ہے جوانوں کا

میداں میداں کھیتوں کھیتوں جشن بپا ہے کسانوں کا

مِل جُل کر سب رُوپ بنیں گے آندھیوں کا طوفانوں کا

مِلّت و قوم و وطن کی جان

طلبہ اور مزدور کسان

میرے جوانوں سے آئے گی جاں بے جان مشینوں میں

جاگ پڑیں امید کی کرنیں ہر بستی کے مکینوں میں

بے مقصد تحلیل نہ ہو گا حق کا خون پسینوں میں

مِلّت و قوم و وطن کی جان

طلبہ اور مزدور کسان

سنہ ۱۹۷۱ء

# پاؤں تھک جائیں تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

پاؤں تھک جائیں تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
اور پھر جاں سے گذر جانے کو جی چاہتا ہے

گرمیٔ شب میں برستی ہوئی شبنم کی طرح
دل کے دریا میں اُتر جانے کو جی چاہتا ہے

کیا سکوں ہے کہ نہ دھڑکن ہے نہ پازیب کا شور
خامشی ایسی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

رقص تھم جائے جنوں کا تو سرِ آخرِ شب
بزمِ یاراں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے

دھڑکنیں دل کی بہت روز سے کچھ تھم سی گئیں
اس کی نظروں سے گذر جانے کو جی چاہتا ہے

محفلِ یار کی کیا بات ہے نقّاش عجیب
دل نہیں چاہتا، پَر جانے کو جی چاہتا ہے

سنہ ۱۹۸۱ء

# نئی دُنیا کے معمار

آج ہے یوم مئی مظلوموں، مجبوروں کا دن

آج ہے محنت کشوں، دہقانوں مزدوروں کا دن

آج کے دن ہوگا پھر تجدید عہدِ انقلاب

آج پھر چھائے گا محنت کے گلستاں پر شباب

آج کا دن روشنی کا، نور کا سُرخی کا دن

آج کا دن نعروں کا، نغموں کا ہمدردی کا دن

آج کی تاریخ مزدوروں کے خون کا رنگ ہے

آج دنیا بھر کے مجبوروں کا یومِ جنگ ہے

ایٹمی طاقت کی ہے یہ اور نہ یہ ذاتی ہے جنگ

یہ فقط انسانیت کی اور طبقاتی ہے جنگ

فتح و آزادی کو بندوقوں سے لایا جائے گا

جنگ کا مفہوم نسلوں کو بتایا جائے گا

اس میں شامل ہیں ہزاروں صاحبِ لوح و قلم

اس میں شامل ہیں وہ جن سے ارتقا کا ہے بھرم

اس میں شامل سینکڑوں محنت کشوں کا خون ہے

آخری جد و جہد کا اک نیا مضمون ہے

اس نے بخشا ہے جنوں کو سر کٹانے کا شعور

گولیاں سینوں پہ آگے بڑھ کے کھانے کا شعور

اس نے دکھلایا ہے تاریکی کے طوفانوں کا شور
اس نے توڑا ہے روایت کے سیہ خانوں کا زور
ایسی جنگوں کی بھی اک تاریخ لکھی جائے گی
جو نئی دنیا کو اصلیّت کا رُخ دکھلائے گی

یہ نئی دنیا کہ ہے مزدور جس کا سربراہ
یہ نئی دنیا کہ ہے دہقان جس کا بادشاہ
یہ نئی دنیا کہ جس کے مارکس و لینن ہیں ستون
یہ نئی دنیا کہ جس میں ماؤ کے بیٹوں کا خون
اس نئی دنیا کے بانی ہیں فیڈ اور اینجل
کھا گئیں سرمایہ داری کا بلائیں جن کے دل

زندہ ہیں رابرٹ اور اسپارٹنز و پارٹیز
جن کے سر پر چل گئی دار و رسن کی تیغِ تیز

ظلم کی دیوار جب جب بھی اٹھائی جائے گی
شورشِ مظلوم سے ہر بار ڈھائی جائے گی

خون کی دھاروں سے روشن جس کی ہے لوحِ جبیں
تا ابد زندہ رہے گی وہ شکاگو کی زمیں

یکم مئی ۱۹۷۱ء

# انجام

موسم بھی
کچھ ٹھیک نہ تھا
کچھ بادل،
زخمی - زخمی تھے
ایسے میں
تیرے پیار کی خاطر
میں نے بھی
گھر چھوڑ دیا
در ـــ چھوڑ دیا

# دن کا کام تو چل جاتا ہے بوجھل یادوں میں

دن کا کام تو چل جاتا ہے بوجھل یادوں میں
لیکن رات کٹے گی کیسے آنکھوں آنکھوں میں

ابکے موسم بدلے گا تو لے کر آؤں گا
اس کے بدن کی ساری خوشبو اپنے ہاتھوں میں

کیسے بدلے زخموں کی ہریالی اپنا روپ
جب تک وہ آباد رہے گا میرے گاؤں میں

جب تک دور نگر سے کوئی سُرخ سویرا آئے
گوری اپنا ہاتھ رنگے گی پیلی سرسوں میں

یوں تو تیز بہت لگتے ہو تم نقّاش ہمیں
پھر بھی اکثر آجاتے ہو دِل کی باتوں میں

۱۹۸۳ء

# انٹرنیشنل

یوجین پوتیئے کے بین الاقوامی انقلابی گیت کا ترجمہ

اُٹھو سزائے بھوک کے نادار قیدیو
اُٹھو زمیں کی گود کے بدبخت ساکنو
اُٹھو کہ آنے والا ہے انصاف کا چلن
ہونے کو منصفی کا یہاں بول بالا ہے
دنیائے رنگ و نو رجنم لینے والی ہے

کٹنے کو ہیں روایت کہنہ کی ساتھیو

پیروں میں جو پڑی ہیں وہ تاریک بیڑیاں

اُٹھو اے بندگی کے غلامو، بس اب اُٹھو

دم توڑتی ہے رسم غلامی و بندگی

اب ہو رہا ہے اک نئی دنیا کا اہتمام

پہلے جہاں میں تھا نہ ہمارا کوئی وقار

اب ہوگا کائنات پہ اپنا ہی اختیار

یہ جنگ آخری ہے

بس اب آخری ہے جنگ

آؤ کہ ہر کوئی نئی تیاریوں کے ساتھ
بڑھ بڑھ کے آگے مورچے اپنے سنبھال لے
انسانیت کا ہوگا نقیب "انٹرنیشنل"
یہ جنگ آخری ہے
بس اب آخری ہے جنگ

آؤ کہ ہر کوئی نئی تیاریوں کے ساتھ
بڑھ بڑھ کے آگے مورچے اپنے سنبھال لے
انسانیت کا ہوگا نقیب "انٹرنیشنل"
یہ جنگ آخری ہے
بس اب آخری ہے جنگ

۱۹۷۲ء

# فیصلہ

جب منزلیں جدا ہوں تو اے میرے ہمسفر
جب راستے الگ ہوں
تو اے میرے ہمنشیں
دنیائے کشمکش کے کسی خاص موڑ پر
ہم کو
ہنسی خوشی سے بچھڑ جانا چاہیئے

۱۹۸۳ء

# بلاؤں سے راہوں کی ڈر جائے گا

بلاؤں سے راہوں کی ڈر جائے گا
اکیلا کہاں ہمسفر جائے گا

ارادوں کے کچے گھڑوں کی قسم
چڑھا ہے جو دریا اُتر جائے گا

اسی سوچ میں لوگ گُم ہو گئے
یہ سیلاب اب کس کے گھر جائے گا

اگر میں نہ اس سے ملوں عمر بھر
تو ایسا نہیں کہ وہ مر جائے گا

جو پہلے تھے کیا کام وہ کر گئے
ترا زہر بھی بے اثر جائے گا

تُو دریاؤں سے دل نہ اپنا لگا
سمندر سا آنکھوں میں بھر جائے گا

ستاروں کے پتھراؤ سے دوستو
مقدر کا شیشہ بکھر جائے گا

ہوئی ہیں جو نقّاش رسوائیاں
ہر الزام اب اپنے سر جائے گا

۱۹۸۱ء

# بڑی جنگ کا رجز

ظلم کی رسم کو دنیا میں بڑھانے والو
خونِ معصوم سے محلوں کو سجانے والو
ہر قدم پر نئی بارود بچھانے والو
امن کے کھیت میں جنگوں کو اگانے والو
اب نہ فصلیں کوئی تم ایسی اُگا سکتے ہو
اب نہ دنیا میں کہیں ظلم اُٹھا سکتے ہو

پہلے کچھ کہتے ہوئے سب کی زباں جلتی تھی
تیر اُٹھنے بھی نہ پاتے تھے کماں جلتی تھی
زندگی قید میں تھی فکرِ جواں جلتی تھی
شعلۂ درد میں زخموں کی دکاں جلتی تھی

ذہن پر خوف کے پہرے تھے کہ خاموش رہو
فکر پابندِ سلاسل تھی کہ مدہوش رہو

کب تلک صبح یونہی صبحِ بیاباں رہتی
کب تلک شام یونہی شامِ غریباں رہتی
کب تلک زیست یونہی شعلہ بداماں رہتی
روحِ تہذیب کے نغموں سے گریزاں رہتی

شورِ زنجیر کے بڑھنے لگے جھنکار کے ساتھ
قافلے والے اُٹھے نغمۂ بیدار کے ساتھ

وقت بدلا ہے تو بدلے گا زمانے کا مزاج
رہ نہیں سکتا زمانے میں سدا ظلم کا راج
خونِ مظلوم کا ایک ایک سے ہم لیں گے خراج
بھوک کے بدلے زمینوں سے اُگائینگے اناج

سماری دنیا میں غریبوں کی حکومت ہو گی
ابنِ آدم کو ہر آدم سے محبت ہو گی

کب تلک خون جوانوں کا بہا سکتے ہو
کب تلک ایٹمی شعلوں پہ نچا سکتے ہو
کب تلک جہل کتابوں سے پڑھا سکتے ہو
کب تلک بھوک زمینوں سے اُگا سکتے ہو

کب تلک رہتا فضاؤں میں اندھیروں کا نظام
کروٹیں لینے لگے دہر کے مظلوم عوام

جنگ آزادی کی لڑنے کے لیے ہے تیار
ایشیا اور افریقہ کے جوانوں کی قطار
نوچ ڈالیں گے حریفوں کی قبائے زرتار
شیر صدیوں سے جو سوتے تھے ہوئے ہیں بیدار

اک بڑی جنگ کی اس عہد میں تیاری ہے
نہ اُٹھے ہم تو یہ تاریخ سے غداری ہے

# صفیں درست کرو

سپاہیانِ شکاگو سے منگھو پیر تلک

سبھی کے ایک سے رستے، سبھی کی ایک سی جنگ

سبھی کے ایک سے میداں، سبھی کی ایک ترنگ

سبھی کے دستِ طلب کو لٹا کے نقدِ حیات

بہ فیض دست ستمگر زمیں کے سینے سے

یہ سُرخ سُرخ فصلاؤں کی مل گئی سوغات:

کہ گرم گرم ارادوں سے چھٹ گئی ہے رات

سپاہیانِ شکاگو سے منگھوپیر تلک
لہو کا ایک ہی نغمہ، نفس کا ایک ہی گیت
جنوں کی ایک سی رسمیں، وفا کی ایک ہی ریت
کہ راہِ حق کے شہیدوں کے خون کی لاج رکھو
کہ جنگ اور وَغا کے عمل کو تیز کرو
کہ انقلاب کے آتش فشاں کے پھٹنے تک
سپاہیوں میں نئے اسلحوں کے بٹنے تک
قبائے عزمِ جواناں کو اور چست کرو
قدم قدم سے ملاؤ، صفیں درست کرو

جون سنہ ۱۹۷۲ء

## جو معاملے ہیں دل کے انہیں آشکار کر دو

جو معاملے ہیں دل کے انہیں آشکار کر دو
کبھی شرمسار ہو لو کبھی شرمسار کر دو

کوئی علم کا ہے مقصد کسی کام بھی تو آؤ
مرے پاس آ کے بیٹھو مرے غم شمار کر دو

کسی سوچ کو پکڑ لو کسی فکر کو سزا دو
وہ جو ذہن ہیں توانا انہیں داغدار کر دو

تمہیں سائے کی طلب میں کڑی دھوپ مل رہی ہے
یہ عبث ہیں جیب و داماں انہیں تار تار کر دو

یہ ہے بزمِ رقصِ بسمل یہاں آکے سوچنا کیا
بڑھو اور بڑھ کے جام و مینا تن و جاں نثار کر دو

وہ جو مجرمِ ہوس تھے وہ ہوا ہوئے ہیں لوگو
مرا جرم بے گناہی، مجھے سنگسار کر دو

کوئی فرد ہو جو عائد صفِ مہ رخاں کی حد میں
دلِ داغدار چھوڑو تنِ داغدار کر دو

۱۹۷۷ء

# ہم لوگ سرِ دار بھی....

اب درد کے رشتے ہیں نہ زخموں سے علاقے
اب کرب کے شیشوں پہ چھناکے نہیں ہوتے
ہر موڑ سے آتی ہیں دھماکوں کی اذانیں!
سب بند ہیں بازارِ سیاست کی دکانیں
اب تیغ بکف رقص میں سب پیر و جواں ہیں
شانوں پہ علَم ہیں کہ صلیبوں کے نشاں ہیں
دَمکے ہوئے رخسار ہیں دہکے ہوئے چہرے
ہاتھوں میں لیے سُرخ اجالوں کے پھریرے

تیغوں کی صدا اُٹھتی ہے مضرابِ جنوں سے

مہکے گی ہر اک راہگزر پھولوں کے خوں سے

دھڑکیں گے نہ خوشبوؤں کے دل کاکُلِ شب سے

نعروں کی گرج آتی ہے ہر گوشۂ لب سے

تم لوگ کہ قاتل بھی مسیحا بھی خدا بھی

تم لوگ کہ انصاف و عدالت بھی سزا بھی

تم لوگ کہ جلاد بھی، تم مفتیٔ دیں بھی

تم لوگ ستمگر بھی ہو مقتل کے امیں بھی

ہم لوگ کہ محنت کی جزا بھی نہ ہماری

تم لوگ کہ بندوق بھی، فوجیں بھی تمہاری

تم لوگ کہ طوفانوں میں شیشوں کے مکاں ہو

تم لوگ کہ پروردۂ سوداگرِ جاں ہو

ہم لوگ سرِ دار بھی غوغا نہیں کرتے

"ہم وہ ہیں کہ جو لاشوں کا سودا نہیں کرتے"

جون ۱۹۷۲ء

# پھولوں کی نمائش دیکھ کر

مرہم زخم وفا تحفۂ گل ہو کہ نہ ہو
تازگی درد کے پھولوں کی بڑھے یا نہ بڑھے
روشنی اوس کی آہٹ سے کھُلے یا نہ کھُلے
تحفۂ ہم نفساں دستۂ گل کی صورت

قصّہ گرمئ حالات کو دہراتا رہا

سرخئ رنگِ دلِ اہلِ وفا کی مانند

نکہتیں دور کہیں دور سے بہلاتی رہیں

صورتیں محفلِ یاراں کی ستاروں کی طرح

دل کے ہر گوشۂ احساس کو گرماتی رہیں

تتلیاں سوچ کی پھولوں میں بھرے رس کے لیے

رات بھر ذہن کے گلدان پہ منڈلاتی رہیں

# ہم نے آنکھ کے پیچھے جا کر دیکھا ہے

ہم نے آنکھ کے پیچھے جا کر دیکھا ہے
ہر تصویر پہ اس کا جیسا چہرا ہے

تم بھی تو زندہ ہو تم نے سوچا ہے
اتنے سال میں کیا کھویا کیا پایا ہے

ہم دونوں کی منزل ایک نہیں ہو گی
ہم دونوں کی سوچ کا دھارا اُلٹا ہے

وقت کے پیچھے دوڑنے والو رُک جاؤ
گذرا موسم ہاتھ کسی کے آیا ہے

چاند پہ تھوکنے والے اپنا مُنہ دیکھیں
آئینہ ، یا آئینے والا سچا ہے

مور نہیں تو جنگل تنہا ناچے گا
اور یہ سب کچھ دیکھنے والا اندھا ہے

ہم لوگوں کے پھول سے چہرے پیاسے ہیں
اور گلدان میں ریت کا سوکھا دریا ہے

سانسوں کا انبار مرے کمرے میں ہے
روشندان پہ جانے کس کا پہرا ہے

ایک اکیلے تم کو نہیں چھُٹنے کا ملال
سنتے ہیں نقّاش بھی اب پچھتاتا ہے

۱۹۸۱ء

# اپنی جنگ رہے گی

اپنی جنگ رہے گی ساتھی
اپنی جنگ رہے گی!
جب تک ہے جسموں میں ہمارے اک اک بوند لہو کی
ساتھی اپنی جنگ رہے گی
رات کا لہجہ تلخ ہے لیکن ہم سب ہیں بیدار
جب تک صبح نہ ہو گی اپنی اونچی ہے تلوار
ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہے ریت کی ہر دیوار
جب تک ہے جسموں میں ہمارے اک اک بوند لہو کی
ساتھی - اپنی جنگ رہے گی

تلواروں کی شکل بنی ہے پاؤں کی ہر زنجیر

اپنے گلے کے خوں سے کریں گے عہدِ وفا تحریر

قربانی کی راہ میں پنہاں قوموں کی تقدیر

جب تک ہے جسموں میں ہمارے اک اک بوند لہو کی

ساتھی۔ اپنی جنگ رہے گی

سرحد سرحد جھوم رہے ہیں انگاروں کے پھول

مانگوں میں افشاں کی بجائے ہے بارود کی دھول

طوقِ غلامی کے آگے ہے موت کی شرط قبول

جب تک ہے جسموں میں ہمارے اک اک بوند لہو کی

ساتھی۔ اپنی جنگ رہے گی

روزِ ازل سے ہوتا آیا شیشوں پر پتھراؤ

کون ہے تہذیبوں کا وارث کس کو امن سمجھاؤ

جنگ ہی انسانوں کی تباہی " جنگ ہی بیچ بچاؤ"

جب تک ہے جسموں میں ہمارے اک اک بوند لہو کی

ساتھی۔ اپنی جنگ رہے گی

# تیسری دنیا کا سورج

کھُل گیا ہے اب تو کلیوں پر بھی گلچینوں کا بھید
پھیلتی جاتی ہے گلزاروں میں خوشیوں کی نوید
ہوتی جاتی ہے چمن اندر چمن اک روشنی
موت کو موت آچلی ہے زندگی میں زندگی
کھُل گئی ہے مکتبوں میں علم کی زندہ کتاب
جیسے صحراؤں کے دامن میں کھِلیں تازہ گلاب
اور اونچے ہوتے جاتے ہیں ادیبوں کے قلم
جیسے جیسے جم رہے ہیں حق پسندوں کے قدم
ہو رہی ہیں غم کی زنجیروں کی ریزہ کاریاں
مٹ رہی ہیں اب تو سرکاروں کی ٹھیکیداریاں

ہل رہا ہے "وہائٹ ہاؤس" کا ہر اک سنگِ سفید
کٹنے والی ہے زمانے بھر کے مظلوموں کی قید
آ گیا ہے قافلہ بندونگ سے لاہور تک
آنکھوں آنکھوں میں مچلتی ہے بغاوت کی چمک
رنگ لائے گا مصدق اور لوممبا کا خون
ناصرِ وسوکارنو کی روح کا روشن ستون
سُرخ کرتا ہے زمیں کو پابلو کا جسم و جاں
روح ایلاندے ہے رقصاں آسماں در آسماں
درس ملتا ہے نمو کا ماؤ کے اقوال سے
مارکس کے لینن کے چو این لائی کے اعمال سے
راہ کی زنجیر اب تو بن گئی ہے ذوالفقار
سب کے سب زیرِ قدم ہیں سامراجی خارزار
اُٹھ چکی ہے کجکلاہوں کی بھی تیغِ بے نیام
تیسری دنیا کے سورج کی شعاعوں کو سلام

جنوری ۱۹۷۵ء

# ویسے تو ہم خود کو پہلے جیسے لگتے ہیں

ویسے تو ہم خود کو پہلے جیسے لگتے ھیں
لیکن کیا ہم اب بھی اس کو اچھے لگتے ہیں

شاید رشتوں کے شیشے میں پڑ گئے ہیں کچھ بال
اس کے طور طریقے بدلے بدلے لگتے ہیں

کرتا ہے جب مجھ سے کوئی بھولنے والی بات
دل پر اس کی یاد کے اکثر نیزے لگتے ہیں

کچھ بولو تو حرف ہوا میں جمتے جاتے ہیں
کچھ سوچو تو آنکھ سے دریا بہنے لگتے ہیں

گونج رہی ہے مجھ میں ابتک اسکی تیز آواز
ٹوٹنے والوں کے لہجے تو دھیمے لگتے ہیں

ترکِ وفا کو ساری عمر ہی سوچنا پڑتا ہے
لیکن فیصلہ کرنے میں کچھ لمحے لگتے ہیں

لوٹتا موسم آنکھ میں آنسو تنہائی کی شام
ڈوبتا سورج اور پرندے کیسے لگتے ہیں

اُبھرے گا نقاش تمہاری تصویروں سے کون
سارے رنگ تمہارے ہم کو جھوٹے لگتے ہیں

۱۹۸۲ء

# ترسی ہوئی رات کا ماتم

صبح ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ لو ختم ہوا
گرمیٔ حسرتِ ناکام کا تاریک سفر
لہجۂ شب کی حرارت کا اُبلتا ہوا زہر
کوہِ آتش کا پگھلتا ہوا لاوا ، یعنی
مرگِ انبوہ رُکا، قتل کا طوفان تھما

پاؤں آزاد ہوئے طوق و رسن ٹوٹ گرے
آج پھر خاک نشیں اپنی جزا کو پہنچے

قتل گاہوں میں جو روشن ہوئے لہو کے وہ چراغ
اپنے چہروں کو اجالوں سے حنا رنگ کیے
پرچمِ فتح لیے نعرہ فگن، رقص کناں
آ گئے ہیں سرِ میداں کہ چلو گیت بنو
ہار دشمن کا نصیبہ ہے، چلو جیت بنو
نور کی بزم سجاؤ کہ چلو رقص کرو
جگمگاؤ سرِ اناں پہ ستاروں کی طرح
پھول مہکاؤ مقدر کے بہاروں کی طرح

صبح ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ لو ختم ہوا

بہہ چلا تھا جو غم دل کے سفینے کو لیے

بن کے آنسو رُخ "ویتنام" پہ قطرہ قطرہ

رُک گیا زخم کے گلشن میں شفق رنگ لہو

موج مے بن کے جو پھیلا کیا دریا دریا

لو کہ روپوش ہوئی شوق کی ترسی ہوئی رات

لو کہ وہ دور سے آتی ہے پھر آوازِ جرس

اب نہ آنسو سرِ مژگاں نہ کوئی صید ہوس

اہل شب آج بھی رسوا سرِ بازار ہوئے

"سُرخ رو" ٹوٹ کے بکھرے بھی تو تلوار ہوئے

سنہ ۱۹۷۳ء

---

(ویتنام کے عوام کی فتح کے موقع پر)

# خود تنقیدی

ہم تو یارو
مشعلوں اور پرچموں سے
جان بچا کر
قوم کے صوفوں میں ۔ آ کر
دھنس گئے

اور ۔ وہ سب
گیت گاتے ۔ گنگناتے
نیند سے بیدار کرتے
سونے والوں کو جگانے
آ رہے ہیں
آج ۔ بھی

# اس سے پہلے نہ کبھی گھر سے جو باہر آیا

اس سے پہلے نہ کبھی گھر سے جو باہر آیا
مجھ سے ملنے مرے خوابوں میں برابر آیا

روز جس سمت سے ہنستے ہوئے پھول آتے تھے
آج آنگن میں اسی سمت سے پتھر آیا

پوچھتا پھرتا ہے لوگوں سے ہوا کا جھونکا
کون خوشبو کے لبادے میں لپٹ کر آیا

باعثِ پرسشِ احوال میں آیا تھا کبھی؟
اتفاقاً مرے رستے میں ترا گھر آیا!

یا تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا

شب کی تاریک فضاؤں میں چراغاں کرنے
ہر کوئی اپنی ہتھیلی پہ لیے سر آیا

لوگ بڑھتے رہے جانوں کا لیے نذرانہ
کچھ اس انداز سے مقتل میں ستمگر آیا

چونکنے والوں نے نقاشؔ غزل سن کے کہا
آج محفل میں کہاں سے یہ سخنور آیا

سنہ ۱۹۸۲ء

# مزدور سربلند ہے دہقان زندہ باد

ہونے کو ہے جہاں میں بہاراں کا اہتمام
ہر اک کرے گا قوت و محنت کا احترام
اونچا رہے گا دہر میں محنت کشوں کا نام
اقلیم دست و بازو کے سلطان زندہ باد
مزدور سربلند ہے دہقان زندہ باد

جنگل ہوں وادیاں ہوں کہ دریا و کوہسار
کرتے ہیں خونِ دل سے زمینوں کو لالہ زار
ہیں مادرِ وطن کے پرستار و جاں نثار
اقلیم دست و بازو کے سُلطان زندہ باد
مزدور سربلند ہے دہقان زندہ باد

بدلا ہے انقلاب سے اب تاجِ افسری
بخشی گئی ہے خاک کو سورج کی ہمسری
حاصل ہوئی ہے دستِ مشقت کو رہبری
اقلیمِ دست و بازو کے سلطان زندہ باد
مزدور سر بلند ہے دہقان زندہ باد

گھر گھر نئی امنگ کے روشن ہوئے چراغ
جگ جگ نئی بہار سے مہکے ہوئے ہیں باغ
تبدیل ہو رہے ہیں سبھی کے دل و دماغ
اقلیمِ دست و بازو کے سلطان زندہ باد
مزدور سر بلند ہے دہقان زندہ باد

۱۹۷۵ء

# بڑا "چانگشا" بھی چپ ہے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ زندہ قوموں پر
کوئی گھڑی کبھی آجائے ۹ ستمبر کی
عظیم باپ کو بیٹوں سے چھین لے کوئی
کہ جیسے روشنیاں بجھ گئی ہوں گھر گھر کی

---

لہ ماؤزے تنگ کے انتقال پر

تمام شہر پہ یوں وحشتیں سی ناچتی ہیں
کہ جیسے مر گئی مظلوم کی امیں داری
کہ جیسے سُرخ پھریرے میں زرد تاروں کی
اُداس آنکھوں میں دھند لاگئی ہو گُل کاری
وہ مرد، جو کہ حریفوں میں شیر افگن تھا
وہ شخص جو کہ صحیفوں کا اِک پیمبر تھا
وہ ذہن شمس و قمر سے بھی تھا سوا روشن
وہ علم و جہد و عمل کا بھی اک سمندر تھا
وہ جس کی یادمیں "پیکنگ" بھی ہے گریہ کناں
وہ جس کے غم میں بڑا "چانگشا" بھی چُپ چُپ ہے
اے انقلاب کے لمحے گذارنے والو!
خدا بھی چُپ ہے اگر، ناخدا بھی چُپ چُپ ہے

۱۹۷۶ء

# کوئی خیال و خواب کی دیوار توڑ کر

کوئی خیال و خواب کی دیوار توڑ کر
درد آشنا ہوا ہے دلوں کو نچوڑ کر

اب راستے میں میں ہوں فقط اور دھواں دھواں
جب سے گیا ہے مجھ پہ وہ تنہائی چھوڑ کر

کوٹوں میں زندگی کے وہ کالر نہیں رہے
جن پر لگا سکے کوئی اک پھول توڑ کر

اب بکے بہت رچے گا ہری مہندیوں کا رنگ
دیکھو تو اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر

سچ تو یہ ہے کہ کوئی فرشتہ نہ آئے گا
چاہو تو تم بھی دیکھ لو دامن نچوڑ کر

پھر آ گیا تھا آنکھوں میں تارے بھرے ہوئے
پہلے بھی ایک بار گیا تھا وہ چھوڑ کر

اک روز مَیں بھی کہہ گیا بچّوں سے دل کی بات
اب کیا ملے گا ٹوٹے کھلونوں کو جوڑ کر

چکنی زمیں پہ بیج بھی بیکار جائیں گے
فصلیں نئی اُگاؤ تو کھیتوں کو گوڑ کر

نقّاش یوں ابھار ذرا نفرتوں کے رنگ
تصویر اس کی بول اُٹھے گردن کو موڑ کر

۱۹۸۲ء

# لہو کا الاؤ

ہاتھوں میں بندوقوں
اور باروودں کی
سوغات لیے
یہ کون آئے ہیں ؟

جن کی جفاؤں

اور ستم نے

شہروں شہروں

گاؤں گاؤں

مہرِ وفا

اور حسن کی ساری سچائی کے

رشتے ناتے توڑ دیئے ہیں

لیکن — ایک الاؤ

لہو کا

سب سے اونچا روشن ہے

جس نے زمیں کے

مٹیالے چہرے کو — مالا مال کیا ہے

لال کیا ہے

جولائی ۱۹۷۲ء

# آنکھ کا سفر

قرنیہ کی پیوند کاری پر ایک نظم

چاند نکلے جو اگر روزنِ دیوار کا رنگ
اپنا ہی خواب بنے خواب کی تعبیر بنے
چاندنی بکھرے تو چمکے سفرِ چشم کی راہ
فکر تحریر بنے آئینہ تصویر بنے

اک ذرا دھندلے چراغوں کی لویں اُکسا دو
کچھ بلند اور ذرا سازِ دلِ آویز کرو
حسرتِ دید مٹے شیشہ و جھنکار بڑھے
موجِ نے تیز کرو رقصِ خوش آمیز کرو

تا ابد روح کے چہروں پر اندھیرا نہ رہے
زندگی ڈوبتے تاروں سے ضیا مانگتی ہے
دل کی راہوں پر شفق رنگ اجالا پھیلے
رنگِ خوں کانپتے ہاتھوں کی حنا مانگتی ہے

ذہن تابندہ رہے جسم نمو میں کھو جائے
چشمِ بے نور اگر دیدۂ بینا ہو جائے

۱۹۸۰ء

# یہ کیسا اس نے عذاب آشنا اتارا دن

یہ کیسا اُس نے عذاب آشنا اُتارا دن
گذر گیا شب، ہجراں کی طرح سارا دن

وہ روشنی میں ہی پھولوں کے رنگ کھِلتا ہے
تو کیوں نہ ہم کو لگے رات سے بھی پیارا دن

تمام رات تو اک شمع ساتھ جلتی رہی
ترے بغیر مگر کس طرح گذارا دن؟

ستم گری کی ابھی تو تمہاری باری ہے
کبھی تو آئے گا تم دیکھنا ہمارا دن

کچھ اس کی زلفِ پریشاں ہی ساتھ دے نہ سکی
جمالِ یار نے یوں تو بہت سنوارا دن

خیالِ دشمنِ جاں سے لپٹ کے سونا ہے
ہوئی ہے شام تو پھر کر گیا کنارا دن

عظیم تر ہیں وہ سب پیڑ دھوپ میں نقّاش
مسافروں کے لیے جو کھڑے ہیں سارا دن

۱۹۸۲ء

# چراغ تلے

(نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے نام)

میانِ کوچۂ اوراق کے چراغ تلے
لرزتی شام کی مانند جو اندھیرا ہے

وہاں سے پاؤں زمینوں میں گاڑ کر دیکھو
کنارِ آب جو رقصاں ہے ایک شعلہ بدن

لہو کے تیل میں جلتی ہوئی چراغ کی لَو
مثالِ برقِ تپاں کس کے سر پہ اترے گی

کہ خود ہمارے لیے حیرتوں کا منظر ہے
سروں پہ اترے ہوئے ہیں یہاں برہمن و شیخ
سیّد و افغان!

میانِ کوچۂ اوراق کے چراغ تلے
لرزتی شام کی مانند جو اندھیرا ہے

اسی اندھیرے کی تاریک راہداری میں
چنگھاڑتا ہوا اک جمِ سرفروشاں ہے

کہ ہم زمینوں کے کیڑے گھناؤنے ہیں ضرور
مگر تمہاری طرح، دور آسمانوں سے

اندھیری نسل کے جغرافیہ میں اُترے ہیں
ہمیں قبول کرو!

۱۹۸۳ء

# ایک مکالمہ غالبؔ سے

عرصہ گذر گیا ہے کہ قدریں بدل گئیں
یعنی جوان پیروں کے دستار کی طرح
استاد بن کے وقت کے سر پر سوار ہیں!
طوفان وہ چڑھے ہیں کہ تاریخ اُلٹ گئی
شاہوں کے تاج آگئے جوتوں کی نوک پر
دربار اُجڑ کے حشر کے میداں میں آ گئے

اک روز ہم نے خواب کے عالم سے چونک کر
غالب "صریر خامہ نوائے سروش" سے
حدِ ادب کے ساتھ کیا اس طرح کلام
تم کو خبر بھی ہے کہ جہانِ خراب میں
کس درجہ رہ گیا ہے کمالِ سپہ گری ؟
البتہ ذوقِ شعر بہت عام ہو گیا
تذلیل اب تو پیشۂ آبا کی ہو گئی
ہے شاعری ذریعۂ عزت بنی ہوئی

فروری ۱۹۸۱ء

---

(ایران میں شہنشاہیت کے خاتمہ کے موقع پہ ایک تاثر)

# ان چراغوں کو کیا ہو گیا میری جاں

تُو جو پلکوں میں اپنی چھپا لے گیا ان چراغوں کو کیا ہو گیا میری جاں
دل کے ویراں منڈیروں پہ رکھا ہوا اک دیا اور آ کر جلا میری جاں

تیرے احساس میں تیرے اقرار میں بے ارادہ تھا میں پھر بھی یوں کُھل گیا
جیسے گہرے سمندر کے اظہار میں بادباں کشتیوں کا کُھلا میری جاں

بادلوں سے یہ کہہ روک دیں یہ جھڑی پل دو پل بات ہے بس گھڑی دو گھڑی
ورنہ سیلاب میں تو بھی بہہ جائے گا اور تھوڑا سا رکھ حوصلہ میری جاں

لوگ کہتے ہیں پھر رت بدلنے کو ہے چاند بادل سے باہر نکلنے کو ہے
شاخِ گُل پر نئی کونپلوں کے لیے تم بھی کرنا خدا سے دعا میری جاں

ریزہ ریزہ نہ ہوں حوصلوں کے قدم کرچیاں کرچیاں پھر سمٹتی نہیں
آندھیاں جب چلیں کھڑکیاں موند لے اور شیشوں سے خود کو بچا میری جاں

تجھ سے ملنا بچھڑنے سے کچھ کم نہیں پھر بچھڑ کر تو ملنا مقدر نہیں
میں کہیں اور ہوں تو کہیں رہ گیا درمیاں ہے یہی فاصلہ میری جاں

میں کہ مقتل میں خود اپنی آواز ہوں اپنا کردار ہوں اپنا انداز ہوں
کس کو آواز دوں کون منصف بنے کیسا قاتل کہاں خوں بہا میری جاں

تیرے فنکار کی بھی ہے خواہش یہی تیرے نقاش کی بھی تمنا ہے یہ !
جیسا شاعر نے تجھ سے کہا تھا کبھی اپنے آنچل کو پرچم بنا میری جاں

۱۹۸۲ء

# شاخِ زیتون

(یاسر عرفات، اقوامِ متحدہ میں)

سُلگتی آگ نہ چھیڑو لہو سے مت کھیلو

لہو تو گرم بگولوں کو بھی نچاتا ہے

اے آسماں کے رفیقو یہ دھوپ کا سورج

اُفق سے روز نکلتا ہے ڈوب جاتا ہے

میں اپنے ہاتھ میں زیتون کی ہوں شاخ لیے
کہ میرے گھر پہ رہے امن کا گھنا سایہ
جو ایک ہاتھ ہے بندوق کو بلند کیے
وہ پیٹتا ہے ہر اک مردِ حق کا دروازہ

میں ایسا مردِ مجاہد ہوں روشنی کی کرن
مرے وجود میں ہر لمحہ جگمگاتی ہے
روائتیں یہ بتاتی ہیں سنگ و آہن کیا
فصیل ہو کہ ہو زنجیر، ٹوٹ جاتی ہے

## نمیبیا کی تحریکِ آزادی کے نام

کہیں دمادم کی ہیں صدائیں
جو میرے کانوں میں
آ رہی ہیں
صدائے تیشہ
نوائے بسمل

لیے ہوئے اپنی جاں کا پرچم
بنے ہوئے تیرگی کا مرہم
عدو کے پنجے مروڑ دیں گے
ہر ایک زنجیر توڑ دیں گے
بکھر کے۔ رہ جائیں گے ستمگر
کھُلیں گی آزادیوں کی راہیں

نئی رُتوں میں
نمیبیا کے سیہ پتنگے
بنیں گے جگنو!

سنہ ۱۹۸۲ء

# برکھا رت کی پہلی پھوار

اے مرے یار تیرے جانے سے
میں نے سمجھا تھا اب خیالوں کی
اور بکھرے تمام خوابوں کی
کوئی قندیل جل سکے گی کہاں
آسمانوں کی سرد راکھوں میں
دل کی چنگاریوں کی صورت سے
اب ستارے کبھی نہ چمکیں گے

اب نظاروں کے خشک جنگل میں
بادلوں سے نہ اوس برسے گی
پھول کوئی ہواؤں کے رُخ پر
صبح دم مُسکرا نہ پائے گا
کوئی خوشبو دلوں سے ٹکرا کر
محفلوں میں بکھر نہ پائے گی
زندگی کے اُداس لمحوں میں
جانے یہ کِس بلا کا ریلا ہے؟
سوچ کا بند بند ٹوٹ گیا
اور۔ پیاسی زمیں کے چہرے پر
آخرِ کار تیری یادوں کی
پھُوار پڑنے لگی ہے" زندہ باد"

۱۹۸۳ء

## کون خیالوں میں آیا ہے کوئی بُت طناز کہ دل

کون خیالوں میں آیا ہے، کوئی بتِ طناز کہ دل
سینے میں کیا بول رہا ہے، دھڑکن کی آواز کہ دل

مقتلِ جاں میں آتو گئے ہم لیکن ابتک سوچ میں ہیں
کون سخن آغاز کرے گا، پہلے تیر انداز کہ دل

رفتہ رفتہ زخمِ وفا کی خوشبو آخر پھیل گئی
کس نے راز کو راز نہ جانا، وہ میرا ہمرازکہ دِل

چین و سکوں، ایمان و حرارت سارے خیال و خواب ہوئے
توڑ گیا پندار کو میرے، کوئی کرشمہ ساز کہ دِل

وصل کا لمحہ کیسے آئے موسمِ گُل کے آنے تک
راستہ کس نے روک رکھا ہے، پیکرِ حیلہ ساز کہ دِل

آہ و فغاں نقاشؔ الاپو شعر و غزل کے لہجے میں
بزمِ طرب خاموش ہوئی ہے ٹوٹ گئے ہیں ساز کہ دِل

۱۹۸۳ء

# ایک فلسطینی بچے کی فریاد

مرے بزرگو مرے عزیزو

میں کیوں نہ روؤں ؟

میں کیوں نہ چیخوں ؟

کہ قومِ موسیٰ کے عسکری بھیڑیئے

میرے پیارے بابا کو دشتِ ظلمت میں کھا گئے ہیں

کہ میرے بھائی کو انکی توپوں کے اژدہوں نے نگل لیا ہے

جو میری "شیشی" میں دودھ "چسنی" میں شہد لانے گئے تھے گھر سے

---

لہ فیض صاحب کی نظم "مت رو بچے" کے حوالے سے پڑھی جائے

میں کیوں نہ روؤں ۔ میں کیوں نہ چیخوں ؟
میں چپ رہوں گا تو موت مجھ کو دبوچ لے گی
میں چپ رہوں گا تو جل نہ جاؤں
کہ میرے چھوٹے مرے کھلونے تو مجھ سے پہلے ہی جل چکے ہیں
میں رو رہا ہوں ۔ کہ میرے آنسو
تمام شیخوں کے، بادشاہوں کے ۔ خلعتوں کو
تمام محراب و منبروں کو
تمام عماموں کو ۔ شاہناموں کو تر کریں گے
میں چیختا ہوں ۔ کہ میری فریاد چیخ بن کر
مرے جوانوں، مجاہدوں، سرفروش لوگوں کے حوصلوں کو
امنگ دے گی ۔ ترنگ دے گی ۔

میں کیوں نہ روؤں ؟
کہ میری "بوتل" میں کون شیرینیاں بھرے گا
کہ شہد سی لوریوں سے ہونٹوں کو تر کرے گا
مرے عزیزو - میں کیوں نہ روؤں ؟
کہ مسجدوں اور ہسپتالوں کے ڈھیر پر
اپنی ماں کے ہاتھوں سے گر پڑا ہوں
جو جنگ کے ان مہیب شعلوں میں گھر کے تنہا پکارتی تھی
بچاؤ - بیروت جل رہا ہے
بچاؤ - لبنان جل رہا ہے

۱۹۸۲ء

# چمکیلے موسموں کا آخری منظر

برف اونچے پہاڑوں کی
چپکے سے پگھلے گی
اک روز
تم ۔ دیکھنا
جیسے ذہنوں کا لاوا
پگھل کر بہے ۔ اور بہتا رہے

جیسے فولاد بھٹی میں

سیّال بن کے بہے۔ اور بہتا رہے

بند بوتل کھُلے اور خوشبو ہواؤں میں تیرے

ہونٹ بجنے لگیں

شور سجنے لگیں

زور۔ ندیوں کا، نالوں کا، دریاؤں کا

دل کے اندر رہنے

پھر سمندر رہنے

برف اونچے پہاڑوں کی

چُپکے سے پگھلے گی۔ اک روز تم دیکھنا

اور سورج کے نیزے

درختوں کے دل میں اُتر جائیں گے

جنوری ۱۹۸۲ء

# وحشت کا ایک لمحہ

جب ستاروں کی انجمن نہ رہی

پھول مُرجھا گئے وفاؤں کے

دن بھی تاریکیوں میں ڈوب گیا

رات بھی سانپ کی طرح آ کر

میرے سینے پہ لوٹ جاتی ہے

کیا خبر ہے بچھڑنے والے کو

ایسا عالم بھی مجھ پہ گذرا ہے

ہر سُلگتی فضا کی زُلفوں کو

ہر مہکتی ہوا کے ہونٹوں کو

میں نے وحشت میں چومنا چاہا

۱۹۸۲ء

## اک میں ہی خاموش رہوں کیا سارے شہر کے بیچ

اک میں ہی خاموش رہوں کیا سارے شہر کے بیچ
جیسے بُلبُلہ جھاگ کا کوئی اونچی لہر کے بیچ

چُپکے چُپکے سانسیں روکے ننگے ننگے پاؤں
دھیان کے رستے کون آیا تھا پچھلے پہر کے بیچ

میرا ساتھ نبھانا ہے تو خود بھی پی کر دیکھ
سوچ رہا ہوں کیا رکھا ہے اب اس زہر کے بیچ

ملبے کے ہر ڈھیر پہ قائم اس کی یاد کے ساتھ
ایک مِرا ہی سر ہے تنہا اتنے قہر کے بیچ

بات کرو نقاشؔ تو سطریں سچائی کی ہوں
جب بھی کوئی شعر کہو تو اچھی بحر کے بیچ

# شورِ کوہِ ندا

جوشش - شیشے کی تلوار
دریا کا دھارا
پہاڑوں کا آتش فشاں
جس کو زہریلے موسم کی خونخوار تنہائیوں نے
کچوکے دیئے
جس کے نازک سے دل پر
سبک چاندنی
نیشتر بن کے آرے چلاتی رہی
اور پُروائی چبھتی رہی

جس کی آنکھوں میں بینائی کی شمع
بجھ بجھ کے جلتی رہی
اور وہ سوچ کے گمشدہ راستوں پہ
پکارا کیا
کس کو راس آئی جغرافیہ کی حدوں میں
مسیحائیاں
پذیرائیاں
کس کو آواز دوں۔

پھر —!
"نجوم و جواہر" سے
"الہام و افکار" کی روشنی چھین کر
کیفِ "آیات و نغمات"

"سنبلِ سلاسل"

"سموم و صبا"

شعرِ "سیف و سبو"

نظمِ "روحِ ادب" دے کے

خود

شورِ کوہِ ندا ہو گیا!

۹ مارچ ۱۹۸۲ء

# ہائی جیکنگ

مزاجِ کج کلہی نے یہ کیوں نہ پہچانا
شرارتیں بھی تو زادِ سفر میں ہوتی ہیں
ہزار ہا شجرِ سایہ دار ہو پھر بھی
رکاوٹیں بھی تو ہر رہگذر میں ہوتی ہیں

مگر یہ کیا کہ ہر اک سمت بزمِ خلقت میں
نہ کوئی سوزِ دروں ہے نہ کوئی پردۂ راز
زمانہ گردشِ ایّام پر نظر تو کرے
چلی ہے رسم فضا میں لڑیں کبوتر و باز

زمیں سے دور کہیں بادلوں کے پردے میں
سُلگ رہا تھا نئی بجلیوں کا پُشتارہ
مسافرت کی تگ و دو میں اُڑ گئے کچھ لوگ
اُفق کی گود سے میری وفا کا طیارہ

# انجمن کی تو ہر بات ہی نرالی ہے

اس انجمن کی تو ہر بات ہی نرالی ہے
ہر ایک شخص یہاں ہم میں یرغمالی ہے

منا رہے ہیں جو کچھ لوگ جشنِ موسمِ دار
انہیں بتاؤ کہ اب رات جانے والی ہے

اجڑ کے رہ گیا بستی میں کوچۂ عشاق
دلوں کے شہر میں بھی اب کے قحط سالی ہے

پرانے زخم ابھی مندمل ہوئے بھی نہ تھے
بنا یہ کس نے نئی وحشتوں کی ڈالی ہے

شعور و فکر کے ہیں میکدوں میں سنّاٹا
خرد کے نام پہ ذہنوں کا جام خالی ہے

ذرا سی دیر تو آنکھوں کو مسکرانے دو
ہنسی لبوں کی ہمارے اگرچہ جُرالی ہے

چلی ہے کیسی ہوا اس کی بادشاہی میں
کہ دست، دستِ طلب ہے نظر سوالی ہے

کسی کی یاد میں نقاش ہم نے اِک تصویر
اندھیری رات کی دیوار پر بنالی ہے

۱۹۸۳ء

# گلچہرہ[1] کی واپسی پر

نازک اندام، لہوزاد، مری گلبدنی
تم نے دیکھا ہی نہیں چہرۂ جاں پر کوئی
آنکھ کی راہ سے بہتا ہوا قطرہ قطرہ
دامنِ دل سے نچوڑا ہوا کوئی آنسو

---

[1] میری اس بیٹی کا نام جو ۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو پیدا ہوئی اور ۱۰ اکتوبر ۸۳ء کو انتقال کر گئی

تم نے تو یہ بھی مری جان گوارا نہ کیا
میرے ہونٹوں کی چھنکتی ہوئی چمکار سنو
تم نے تو یہ بھی نہ چاہا کہ کوئی ماں کی طرح
اپنے سینے سے نہیں، روح کی گہرائی سے
ایک گڑیا کے لیے دودھیا آنچل پھیلائے

خیر تم کو بڑی عجلت تھی، کوئی بات نہیں
اور کچھ روز مہک لیتیں تو شاید مری جاں
چہرۂ گُل کو جُھلانے کو صبا آجاتی
اور تُم کو بھی ہُمکنے کی ادا آجاتی

# شہرِ وفا کی قسمت میں

بولو کہ یہ میّت کس کی ہے
بولو یہ جنازہ کس کا ہے
یہ کس کا ستوں ہے کون گرا
یہ کون تھا کس کا خون بہا

مرتی ہوئی کرنوں کی صورت

یہ علم کی بیٹی کس کی ہے

ڈھلتے ہوئے سورج کو دیکھو

گرتا ہوا بیٹا کس کا ہے

انمول بہاروں سے کے جیسے

یہ جلتے خزانے کس کے ہیں

بہتے ہوئے خوں کی تھاپ ستو

ماتم کی صدائیں کس کی ہیں

کچھ لوگ کہ جاں کو ہار آئے

کچھ لوگ سدا کے کچے تھے

وہ لوگ پھر اب کے جیت گئے
وہ جن کے نشانے پکے تھے
اب شہرِ وفا کے دامن میں
بس آگ دھواں اور شعلے ہیں
اب شہرِ وفا کی قسمت میں
بس مقتلِ جاں کے تحفے ہیں

اپریل ۱۹۸۰ء

# نشانی

زمیں کی اوٹ سے جھانکو
تو اک ستارہ سا
اندھیری رات کی تاریک "رازداری" میں
اُفق کی گود میں
روشن دکھائی دیتا ہے
مری وفا سے جو پوچھو تو یہ حقیقت ہے
وہی ستارہ
تری یاد کی نشانی ہے

سنہ ۱۹۸۵ء

# کون سی وہ زبان بولتا ہے

کون سی وہ زبان بولتا ہے
جیسے اک آسمان بولتا ہے

جسم میں کشتیاں سی تیرتی ہیں
روح میں بادبان بولتا ہے

مجھ کو لگتی ہے اپنی ہر آواز
جیسے خالی مکان بولتا ہے

دھوپ تو چپ کھڑی ہے آنگن میں
سائے سے سائبان بولتا ہے

وہم ایک باہری حوالہ ہے
اور اندر گمان بولتا ہے

چھوٹے چھوٹے سے گھر ہیں سہمے ہوئے
لیکن اونچا مکان بولتا ہے

کس سے چھپتا ہے خون کا لہجہ
میرے قاتل، نشان بولتا ہے

کوئی میرے سوا بھی ہے جو اسے
پیار سے میری جان بولتا ہے

زخم ہو، چوٹ ہو کہ بوسہ ہو
درد کا ہر نشان بولتا ہے

تم اگر چپ رہو تو کیا نقاش
اب تو سارا جہان بولتا ہے

۱۹۸۳ء

## کوئی تو آخر اس دھرتی پر روپ تمہارا جانے گا

کوئی تو آخر اس دھرتی پر روپ تمہارا جانے گا
چاند کے اوپر خاک پڑے گی پھول سے پیارا جانے گا

درد کے کیا کیا رنگ کھلیں گے کیا مطلب انگڑائی کا
آنکھ اگر خاموش رہے گی جسم تو سارا جانے گا

ہم کو تو اِس دشتِ جنوں میں سورج اچھا لگتا ہے
سائے کی اوقات ہے جو بھی دھوپ کنارا جانے گا

ممکن ہے بیماریِ دل کی صورت اور کوئی ہو جائے
جب تک یار و جانِ مسیحا حال ہمارا جانے گا

ہر چہرہ بے چہرہ ہو کر کورا کاغذ چھوڑ گیا
اب بینائی ماند پڑے تو آنکھ کا تارا جانے گا

تنہا چھوڑ کے جانے والا آنچل لوٹ کے آیا تو
ہم نے اس کی یاد میں کیسے وقت گزارا جانے گا

سنہ ۱۹۸۳ء

# کارڈیوگرام

کارڈیو ویسکولر ہسپتال میں لکھی گئی

جہاں میں ہوں وہاں از رہِ رسمِ دل داری
ہر ایک حلقہ بہ حلقہ چلا ہی آتا ہے
مگر جو آ نہیں پاتا وہ دل کے طاقوں میں
نہ جانے کیسے لہو کے دیئے جلاتا ہے

دیئے لہو کے جلیں یا کہ مشعلِ جاں کے
ستم کی راہ میں شامل ہے ہر جراحتِ دل
یہ دستِ رنگِ حنا، پھول خواہشوں کے پیام
کہ وہ جفا پہ ہو نازاں تو میں وفا پہ خجل

یہ ای۔ سی۔ جی[2] بھی عجب ہے، عجب ہے "کارڈیوگرام"[1]
جو سارے بند دریچوں کو کھول دیتا ہے
میں چپ ہوں پر مرے دل میں جو ایک تہلکہ ہے
وہ درد و زخم کا ہر نام بول دیتا ہے

مئی ۱۹۸۵ء

---

[1] CARDIO GRAM [2] E. C. G

# مت آؤ تو اچھا ہے

جب درد نہیں تھمتا
جب نبض نہیں رُکتی
پھر آنے سے کیا حاصل
کیوں یونہی تم آتے ہو
مت آؤ تو اچھا ہے
مت آؤ تو اچھا ہے

جب زخم مہکتے ہیں
تم کھل بھی نہیں سکتے
جب یاد ستاتی ہے
تم مِل بھی نہیں سکتے
پھر آنے سے کیا حاصل
مت آؤ تو اچھا ہے
ہاں رات کی تاریکی!
بل کھا کے مچلتی ہے
ہاں دِل کے دریچوں میں
پُروائی بھی چلتی ہے
پھر آنے سے کیا حاصل
مت آؤ تو اچھا ہے

زخموں سے بھرا سینہ
جب زہر اُگلتا ہے
اس وقت بھی خنجر سا
ہر لفظ کا چلتا ہے
پھر آنے سے کیا حاصل
مت آؤ تو اچھا ہے
ماتھے پہ کوئی رکھ کر
ہونٹوں کو نہ جب پوچھے
آنکھوں سے کوئی چھو کر
نبضوں کو نہ جب دیکھے
پھر آنے سے کیا حاصل
مت آؤ تو اچھا ہے

دنیا کو دکھانے کو

بس یونہی چلے آنا

لمحوں کی اداسی کو

کچھ اور بڑھا جانا

پھر آنے سے کیا حاصل

مت آؤ تو اچھا ہے

دسمبر ۱۹۸۵ء

# ابھی ابھی تو پرندے نے پر نکالا ہے

ابھی ابھی تو پرندے نے پَر نکالا ہے
سنا ہے رنگ درختوں کا اُڑنے والا ہے

"تم آ گئے ہو تو آؤ گلے لگائیں تمہیں"
یہ جان کر بھی، جو آیا ہے جانے والا ہے

ترے چراغ کی لَو جل رہی ہے سانسوں میں
قدم قدم پہ ترے نام کا اُجالا ہے

میں خود پہ اپنی ہی دیوار بن کے گر جاتا
کسی کی زُلف نے لیکن مجھے سنبھالا ہے

میں اس کا درد کسی کو بھی دوں تو کیسے دوں
وہ زخم میں نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے

دھنک دھنک سی نگاہوں میں تیر اُٹھی نقاش
زمیں نے پیار کے رنگوں کو یوں اُچھالا ہے

۱۹۸۳ء

# ہارٹ اٹیک اور دامنِ گُل

وہ خواب تھا کہ حقیقت، بیاں سے باہر ہے
بکھر رہی تھی خلاؤں میں کہکشاؤں کی راکھ
اُتر رہی تھی سیاہی شبِ اجل کی طرح
عجب تھا کرب کا عالم کہ سانس تھی نہ سکوں
ادھر بدن تھا کہ بے آگ ہی سُلگتا تھا
نفس نفس میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ بس
مرے کلیجے کی سرسبز شاخسار دل پر!
یہ کون مصر کا اہرام رکھ کے بھول گیا
نیاگرا کے پُراسرار آبشاروں میں!
مرے وجود کی سچائیوں کو گھول گیا

یہ وقت وہ تھا کہ جس میں کھلا یہ رازِ دروں
ہے حق ہمسفری، جلوۂ شریکِ حیات
کہ رہگذر میں مسیحا نفس اسی کی ہے ذات
وگرنہ ہر کوئی محبوبیت کی خواہش میں
لہو لہو کرے مینا و ساغرِ مے و ناب
دیارِ کوچۂ پیغمبراں سے کچھ آگے
پہنچ کے سوچ رہا ہوں کہ کس نے مجھ کو دیئے
حصارِ سامریوں کی نحوستوں کے خلاف
فشارِ خوں ہو کہ وحشت کہ حملۂ دل و جاں
جو حق لکھوں تو یہ انصاف کی ترازو ہے
جو سچ کہوں تو یہ تاریخ کی گواہی ہے

زمینِ مقتلِ جاں خواب دیکھتی ہی رہی
بچا کے لے گئی مجھ کو ہوائے "دامنِ گل"

---

۲۴ مئی ۸۵ء کی شب حملہ قلب کی صورت میں علیل ہو جانے کے بعد رو بہ صحت ہونے پر کہی گئی

# راس آئی محبّت کی مشقّت ہمیں کب تھی

راس آئی محبت کی مشقت ہمیں کب تھی
کچھ اپنی طبیّعت بھی تو آرام طلب تھی

جس رات مِرا دَم تھا کہ دل روند رہا تھا
وہ رات میری جان بڑے درد کی شب تھی

کچھ کہہ نہ سکا تو بھی عیادت کی زباں میں
گم صُم وہ تیری ذات تھی یا جنبشِ لب تھی

سچ پوچھو تو اب عمر درازی کی دعا میں
کچھ صحبتِ شب تھی نہ کوئی صبح طرب تھی

ہم بھی کوئی کم تھے کہ ڈبو دیتے سفینہ
گو موجِ بلا اپنے ارادوں میں غضب تھی

مل جانے کی خواہش بھی، بچھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجب تھی

اک ہم تھے کہ خوش فہمیٔ حالات میں گم تھے
لیکن اسے حاجت مری اب ہے کہ نہ جب تھی

نقّاشؔ ہر اک شخص وہ شے ڈھونڈ رہا ہے
جو ضربِ شکستِ دلِ شاعر کا سبب تھی

سنہ ۱۹۸۵ء

# خون کا حوالہ

بنجمن مولائسؔ[1] کی یاد میں

تم نے بھی غم کے زہر سے دامن چھڑا لیا
لو تم بھی اب تو سیکھ گئے مہوشوں کی چال
لو تم بھی جا کے دار کی شاخوں پہ سو گئے
تم بھی شبِ ستم میں ہوئے چاندنی مثال

---

[1] ۲۸ سالہ سیاہ فام شاعر اور وطن پرست رہنما جسے ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو جنوبی افریقہ میں پھانسی دے دی گئی

تم نے بھی اہلِ درد کی بے رنگ شکل پر
پل میں دیارِ ظلم کی رنگت اُچھال دی
تم پر بھی ہاں تمام ہوئی خوشبوؤں کی راہ
تم نے بھی موجِ گل میں حرارت سی ڈال دی

مانا کہ ایک سر تو تمہارا ہوا "قلم"
لیکن ہر ایک شعر کا ماتھا اُٹھا دیا
مانا کہ ایک نظم ہوئی قطع اس گھڑی
لیکن تمہارے خوں نے "حوالہ" بڑھا دیا

# درد کا ساز بنو

ہاں سنو !
اے مِرے قاتل
مرِے دلدار سنو
تم مرے پاس رہو یا نہ رہو
تم مرِے ساتھ چلو یا نہ چلو
میرے ہمدرد بنو یا نہ بنو
درد کا ساز بنو
زخم کا ہمراز بنو

کچھ بنو یا نہ بنو
"آکسیجن" کی طرح خون کی شریانوں میں
پیوست رہو
مست رہو
میرے قاتل۔ مرے دلدار سنو۔!
اپنی یادوں کو تو بھیجو کہ سرہانے میرے
کچھ "گلوکوز" کی بوتل کی "ڈرپ"
میری دم ساز بنے
اور قدم ساز بنے

---

بستر علالت پر ۔ ۲۷ جون ۱۹۸۵ء

## صحرا میں جو وحشی ترا فریاد کرے گا

صحرا میں جو وحشی کوئی فریاد کرے گا
موسم بڑی شدت سے تجھے یاد کرے گا

سینے میں دھڑکنے کی تو شے اور کوئی ہے
دل ہو گا تو انسان کو برباد کرے گا

اکرام و نوازش کی جو خوشبو نہیں اس میں
کیا کیا نہ ستم وہ ستم ایجاد کرے گا

یادوں کے جزیرے میں وہ اترا بھی تو میرے
پلکوں پہ ستاروں کو بھی آباد کرے گا

چھینی ہوئی رنگت ہے چرائی ہوئی خوشبو
کس کس کو رہا دامنِ صیاد کرے گا

پہلے تو وہ کھو جائے گا رسموں کے نگر میں
پھر گود میں رکھا مرا سر یاد کرے گا

شانوں پہ نہ سر ہوں گے نہ ہر پاؤں میں زنجیر
جب فیصلہ خود یہ دلِ بیداد کرے گا

مر جاؤں گا نقّاش میں تنہائی کے ڈر سے
جس دم وہ مری ذات کو آزاد کرے گا

۱۹۸۳ء

# آسماں کا نہ رکھا روئے زمیں کا نہ رکھا

آسماں کا نہ رکھا روئے زمیں کا نہ رکھا
عشق نے اس دلِ وحشی کو کہیں کا نہ رکھا

وہ بھی گھر ہے کوئی، گرتا ہے تو گرنے دو اسے
آج تک جس نے بھرم اپنے مکیں کا نہ رکھا

مال اپنا ہی سنبھالا کیے تا عمرِ عزیز
دل بھی رکھا تو کسی زہرہ جبیں کا نہ رکھا

اس کی ہر بات پہ رہ رہ کے گذرتا تھا قیاس
وسوسہ یوں تو بہت تھا پہ قریں کا نہ رکھا

کر دیا زیرِ عبا سارے گناہوں کا حساب
قرض ہم نے بھی کوئی مفتیٔ دیں کا نہ رکھا

ہم بھی نقّاشؔ پلٹ آئے بغیر اس سے ملے
ذہن میں سب تھا مگر دھیان وہیں کا نہ رکھا

۱۹۸۵ء

# گنتی

وہ پتھر تھا
اس کی آنکھیں
اس کے ہونٹ بھی
پتھر کے تھے
میں نے ان میں روح بھری
اور جاں کھینچی تھی
پھر وہ اپنی شریانوں میں
سُرخ لہو کا، ایندھن پا کر
میری گنتی بھول گیا

۱۹۸۵ء

# عید کا چاند دیکھ کر

یہ خبر سن کے فلک پر ہے عیاں عید کا چاند
دل کی شاخوں پہ کئی درد کے تارے چمکے

ہم نے دیکھا تو افق پر تھا سمندر کا سکوت
ہاں ترے ساتھ جو گذرے تھے نظارے چمکے

پھر نئی صبح کی آمد کا خیال آتے ہی
ہر رگ و پے میں امنگوں کے شرارے چمکے

دھڑکنوں نے یہ خبر دی ہے کہ دونوں جانب
دور ہی دور سے آنکھوں کے کنارے چمکے

وہ جو شاعر ترا بیمار بھی دلگیر بھی ہے
عید کے دن تری قربت کے سہارے چمکے

جون ۱۹۸۵ء

# کہ رہ نہ جائے کہیں حوصلہ بھی کم اس کا

کہ رہ نہ جائے کہیں حوصلہ بھی کم اُس کا
اٹھا رہے ہیں بصد شوق ہر ستم اُس کا

گیا جو دامنِ دربار میں وہ خوار ہوا
جو رہ گیا سرِ میداں ہوا علم اُس کا

ہوا ہے حکم کہ اب شہرِ سر فروشاں میں
جو سر اُٹھا کے چلے سر کرو قلم اُس کا

گر اس کی ذات کو آزارِ جاں کا شکوہ ہے
بدن کو چاٹ رہا ہے مرے بھی غم اُس کا

اسے بھی وحشتِ دل کا نہیں تھا اندازہ
حصار ٹوٹ رہا ہے قدم قدم اُس کا

جو کاغذی ہے وہ ہر ناؤ ڈوب جائے گی
تو سطحِ آب پہ کھُل جائے گا بھرم اُس کا

جو سر نہیں ہے تو دستار کی ضرورت کیا
سروں کے ساتھ عبارت ہے پیچ و خم اُس کا

نہ ہم رہیں گے تو تاریخ یہ بھی دیکھے گی!
کہاں رہے گا یہ اندازِ جاہ و حشم اُس کا

مجھے تو بھیج دیا ہے تسلیوں کا پیام
یہ اور بات کہ دامن ہوا ہے نم اُس کا

تجھے متاعِ ہنر دے گیا ہے جو نقاش
غزل میں ذکر ضروری ہے بیش و کم اُس کا

۱۹۸۳ء

# ماں کی یاد میں

اُسے بھی گود کی گرمی ذرا ملے تو سہی
مرے خیال میں خود کو نہال کر دے گا
اُسے بھی پاؤں کی جنت ذرا ملے تو سہی
مرے خیال میں یکبارگی تو کھ دے گا

"یہ کائنات سمٹ جائے تو وفا کی قسم
تمہارے نقشِ کفِ پا سے کچھ زیادہ نہیں
یہ آسماں و زمیں اوڑھ کر بھی دیکھوں اگر
تو ماں کی گود سے بڑھ کر کوئی لبادہ نہیں"

کہ جس نے لوریاں دے کر سُلا دیا تو۔ مگر
اسی کی ذات نے پھر پیار سے جگایا ہے
یقین ہو کہ نہ ہو جلتے بُجھتے لمحوں پر
تمہاری یاد نہیں جُگنوؤں کا سایہ ہے

فروری ۱۹۸۶ء

# وقت آیا ہے ہواؤں کی گرفتاری کا

وقت آیا ہے ہواؤں کی گرفتاری کا
رنگ دیکھیں گے چراغوں کی وفاداری کا

ایک ہلچل نظر آتی ہے سرِ بزمِ خیام
حکم ملنا ہے ابھی کوچ کی تیّاری کا

کھُل گئے منبر و محراب کے اسرار و رموز
بھید کھلنے کو ہے دستار کی تہہ داری کا

صبح تک ایک نئے عزم سے گایا جائے
کوئی نغمہ شبِ تاریک میں بیداری کا

وہ جو ملزم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حُسن سے غداری کا

منصب دار پہ فائز ہو تو کچھ بات بنے!
تاج ہم بھی اسے پہنائیں گے سرداری کا

خود کو کر دیتے ہیں جو پنجۂ اعدا کے سُپرد
معترف کون نہیں ان کی کماں داری کا

کام سب آ ہی چکے راہ رووں میں اپنے
منتظر ہے کوئی مقتل میں مری باری کا

دلبری کا ہر اک انداز تجھُی سے آیا
ہر سبق یاد رکھیں گے تری دلداری کا

ہم سخن اور بھی ہوں گے ترے نقاش مگر
حوصلہ چاہیے غالب کی طرفداری کا

سنہ ۱۹۸۴ء

# مارکوس کی سزا

ہم نہ کہتے تھے کہ فلپینی نژاد
عورتوں کی فکر عالی شان ہے
دیکھ لو اکینو کو فلپائن کی
پرچمِ جمہوریت کی آن ہے

فتح و نصرت کے جیالو۔ زندہ باد
قتل گاہوں سے صدائیں آئیں گی
حبس کی بوجھل ہوا جانے کو ہے
اب بہاروں کی ہوائیں آئیں گی

ہاں عوامی قافلوں کے غیض سے
آدمیت کی یہی ناموس ہے
اک ستونِ دار پھر گرنے کو ہے
زلزلوں کی زد میں وہائٹ ہاوس ہے

دیکھ لے دنیا سزائے مارکوس
کیسے ہوتے ہیں سیاسی چاپلوس

(فی البدیہہ)

فروری ۱۹۸۶ء

# نیا بنجارہ نامہ

اے صدر نشینو ــــ تاجورو!

اے آمر و جابر بادشہو!

اس وقت جو چاہو سو وہ کرو!

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا

جب تاج اُچھالے جائیں گے

جب تخت گرائے جائیں گے

یہ قتل گہیں یہ شمشیریں
یہ قید و حرم یہ زنجیریں
یہ پرچیاں، ووٹ، یہ تعزیریں

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

کانٹوں بھری شاخیں ظلم کا پھل
یہ تاج و محل یہ فردِ عمل
توپیں، بندوقیں، چنگ و طبل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

یہ پھانسی، پھندے تقریریں
یہ تختہ دار کی تدبیریں
یہ "ملا ازم" کی تکبیریں
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

توڑے گا سر دل پر برقِ تپاں
بڑھ بڑھ کے عوامی سیلِ رواں
تنگ ہوگی زمیں جاؤ گے کہاں
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

مارچ ۱۹۸۶ء

# پیار کی چِتا

بے نور سی زرد زرد آنکھیں
سوکھے ہوئے ہونٹ
بے صدا سے
کُمھلایا ہوا دھواں دھواں سا چہرہ
اے میرے خدائے رنگ و نکہت
مت دیکھ انہیں
حقارتوں سے
یہ تیرے ہی پیار کی چِتا ہیں
مُدّت ہوئی
جَل کے بُجھ چکے ہیں

مارچ ۱۹۸۵ء

# آنکھوں کی قندیل بجھائے خواب اسی کے دیکھوں

آنکھوں کی قندیل بجھائے۔ خواب اسی کے دیکھوں
دروازوں میں کان لگائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

اُمیدوں کا دیا جلائے۔ خواب اسی کے دیکھوں
یادوں کا اک شہر بسائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

تتلی بن کر اُڑنے والا لوٹ کے شاید آئے
گُلدانوں میں پھول سجائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

چہرے اور ہیں سائے اور ہیں۔ اور ہیں دل کی راہیں
دنیا لاکھ مجھے سمجھائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

آنکھوں سے ایک دریا نکلے۔ اور اوجھل ہو جائے
ریت سمندر میں کھو جائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

میری دید کا ایک ہی موسم کیا رنگت کیا روپ
منظر کوئی آئے جائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

دل پر چھایا درد کا بادل اور چہرے پر دھول
زخموں کے آزار اٹھائے۔ خواب اسی کے دیکھوں

۱۹۸۴ء

# یہ تو بات الگ ہے پھول اور خوشبو سے بھر جاؤ گے

یہ تو بات الگ ہے پھول اور خوشبو سے بھر جاؤ گے
لیکن اب کے عشق کیا تو جیتے جی مر جاؤ گے

لوگ تو چھُپ چھُپ کر بیٹھے ہیں روزن و در سب بند کیئے
دھڑکن کی آواز کے پیچھے اب کس کے گھر جاؤ گے

تم ساحل پر لہریں گننے والوں کے سردار سہی
ایک قدم پانی میں رکھ کر موجوں سے ڈر جاؤ گے

یہ خواہش بھی پوری ہو گی ہر اِک گلاب کے کھِلے
لیکن ہر موسم کے تازہ کانٹوں سے بھر جاؤ گے

پار اترنا کھیل نہیں ہے اتنا پیارے جزیرے پر
آگ کا دریا پار کرو گے سات سمندر جاؤ گے

ننھے مُنے بچوں سے سب رشتے اکثر پوچھتے ہیں
پیارے ابّو، اچھی امّی، بولو کس پر جاؤ گے؟

نام تو یوں نقّاش سہارے اور بھی زندہ رہتے ہیں
بات تو جب ہے دنیا کی تاریخ میں کچھ کر جاؤ گے

جون ۱۹۸۵ء

# بیادِ فیض

شبِ انجمن سے چراغِ جاں وہ جو لے کے تا بہ سحر گیا
اسی شہر یار کو ڈھونڈیے کہ ستارے آنکھوں میں بھر گیا

کبھی وہ بپھرا تھا قفس قفس پئے قتل گاہوں کا بانکپن
کبھی ہو گیا وہ جلا وطن تو لہو لہو میں بکھر گیا

بڑی کشمکش میں ہیں چارہ گر صفِ دشمناں بھی اُداس ہے
جو زمیں کے بیٹوں کی لاج تھا وہ زمیں کی کوکھ میں اُتر گیا

وہ نقیبِ کوچۂ امن تھا، وہ حریفِ بادۂ ظلم تھا
جو رُکا تو کوہِ گراں رہا جو چلا تو جاں سے گذر گیا

رہِ یار ہیں تو قدم قدم کوئی دو گھڑی کا حساب تھا
مرے محتسب تری خیر ہو وہی قرضِ جاں تو اُتر گیا

پسِ مرگ دامنِ کوہ میں کوئی جو کشش کو یہ خبر کرو
تپِ شوق میں ترا فیض بھی یہ خبر اُڑی ہے کہ مر گیا

نومبر ۱۹۸۳ء

# سر وہ ہے کہ جو شوخئ تلوار سے اترے

سر وہ ہے کہ جو شوخئ تلوار سے اُترے
قامت بھی وہی جو رسن و دار سے اُترے

اک خواہشِ اقرار میں پیوستِ گلو کو
سو تیر کمانِ لب انکار سے اُترے

ان دھندلے نوشتوں کو بھلا کون پڑھے گا
جب رنگِ وفا صورتِ دیوار سے اُترے

اے نکتہ ورو شے وہ خرید وگے تو بولو
قیمت میں جو کم رونقِ بازار سے اُترے

وہ برقِ شرر بار ہو شعلہ کہ ستارا
ہم تیرہ نصیبوں میں شب تارسے اُترے

کچھ پوچھو نہ عالم دلِ وحشت زدگاں کا
جب دھوپ قبائے درو دیوار سے اُترے

سب دیدہ و دل فرش کیے بیٹھے ہیں کب سے
پھر زخم کوئی ناوکِ دلدار سے اُترے

نقاش سمجھنا کہ یہی رختِ جنوں ہے
جب قطرۂ خون دیدۂ بیدار سے اُترے

۱۹۸۵ء

# پھر جھیل سی آنکھوں کی پلکوں کو اٹھانا ہے

پھر جھیل سی آنکھوں کی پلکوں کو اٹھانا ہے
ٹھہرے ہوئے پانی میں اک آگ لگانا ہے

یہ فرض بھی اپنا ہے جب دھوپ گذر جائے
منہ زور ہواؤں میں اک شمع جلانا ہے

وہ بن ہو کہ صحرا ہو دیوانے کو کیا مطلب
زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اُڑانا ہے

جون ۱۹۸۵ء

غیروں کی طرح آنا غیروں کی طرح جانا
یہ بھی کوئی آنا ہے یہ بھی کوئی جانا ہے

وہ چرخِ کہن آکر پھر چھین نہ لے مجھ سے
ٹوٹے ہوئے کچھ تارے ہونٹوں میں چھپانا ہے

اس بار بھی چاہو تو رہ رہ کے مہک لینا
اب صحن میں پھولوں کی دیوار اُٹھانا ہے

فطرت ہی کے ہاتھوں میں ہے رسمِ حنا بندی
جائے کہ ٹھہر جائے کیا دل کا ٹھکانا ہے

نقاش نئے پن کی کچھ تازگی لے آؤ
ہر شخص کی نظروں میں یہ زخم پرانا ہے

# اکتالیسواں دروازہ

جب عمر کے شہرِ زنداں کے
چالیس[1] دروازے
بند ہوئے تو
اکتالیسواں[41]
منہ کھولے
بازو پھیلائے
شمعوں کی فانوس لیے
کیک اور چھری کا جشن منائے
نیک تمناؤں میں
بیوی بچوں کی سوغات لیے
محبوبوں کی سی شکل بنائے
"بے تالی"
خاموش کھڑا ہے

---

1. اپنی چالیسویں سالگرہ پر ایک نظم

## پھولوں کی طرح کھل کے جو پل بھر ہے نہ ملنا

پھولوں کی طرح کھل کے جو پل بھر ہے نہ ملنا
اس ڈھنگ کے ملنے تو بہتر ہے نہ ملنا

ملنا بھی ترا وادیٔ جاں میں ہے دو آبہ
جاگی ہوئی آنکھوں میں سمندر ہے نہ ملنا

دل ملنا تو اک حادثۂ وقت ہے، لیکن
بچھڑی ہوئی چاہت کا مقدر ہے نہ ملنا

دیکھو تو گلے ملنے سے جی اُٹھتا ہوں کیسے
جاناں ترے مرنے کے برابر ہے نہ ملنا

شیشہ کوئی آنکھوں کوئی ہونٹوں کا جما دو
جب میری انگوٹھی کو تو پتھر ہے نہ ملنا

اک خواہشِ دیرینہ ہے جب چاہے بسا لو
سب سے بڑی مشکل تو کوئی گھر ہے نہ ملنا

یہ بھی سرِ میخانہ کوئی چال نئی ہے
اب گردشِ کوزہ ہے کہ ساغر ہے نہ ملنا

سلطانیِ جمہور کے نیزوں پہ جو بولے
اس انجمنِ ناز میں وہ سر ہے نہ ملنا

کہہ دو کہ ہر اک شہر میں شب خون ہی مارے
اب فوج کی قسمت میں تو لشکر ہے نہ ملنا

دن بھر ترے کھونے کی ادا ٹھیک ہے لیکن
نقاشِ ترا رانوں کو بھی گھر ہے نہ ملنا

۱۹۸۶ء

# رُخِ سیلاب

بن کر پہاڑ
ریت کی دیوار — یا چٹان
جو ہو سکے تو
تم بھی کوئی راہ روکنا
ہم آ رہے ہیں شہر میں
سیلاب کی طرح

# رسّی

ایک رسّی اللہ کی
ایک رسی تمہاری
اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا
رحمتوں اور برکتوں کا انعام ہے۔
ہاں تمہاری رسی
گلا دبا کر
زبان اور آنکھیں
باہر نکال دیتی ہے
لیکن
"قد لمبا ہو جاتا ہے"

---

۴، اپریل کی ایک نظم

# مصنّف کے کوائف

نام : نقّاش کاظمی

پیدائش : ۲۶ ، فروری ۱۹۴۴ء (جون پور) یوپی

تعلیم : میٹرک ۔ کراچی بورڈ ۱۹۶۰ء

ایف۔ایس سی (سندھ مسلم سائنس کالج)

گریجویشن (اردو کالج کراچی)

ایم اے (اردو لسانیات) ایم اے (اردو ادبیات)

ایم اے (سیاسیات) کراچی یونیورسٹی

اضافی قابلیت :

ٹی۔ای۔اینڈ۔ڈبلیو۔ایس (پاکستان)

ایس۔ای۔ایس۔ درجہ اوّل

مصروفیات :

ایس۔ڈی۔او (محکمہ مواصلات پاکستان)

سابق استاد شعبۂ اردو ۔ ضیاءالدین میموریل کالج کراچی

سابق استاد و نگران شعبۂ اردو (شام) سراج الدولہ کالج۔کراچی

سابق نائب ممتحن (انٹرمیڈیٹ بورڈ ، کراچی)

تصنیفات :

"چاندنی اور سمندر" (شاعری)

"رُخِ سیلاب" (شاعری)

"افروایشیائی ادیبوں کے مسائل اور ان کا پس منظر" (نثر)

سرخیاں (ادبی تنقید)

مدیر برگِ گل سرسید نمبر برائے نصاب سالِ آخر (ایم اے اردو) جامعہ کراچی ۔

شریکِ حیات : گلزار فاطمہ

بیٹی : شعروینہ نقّاش

بیٹے : علی رامش ۔ علی دانش

"نقاش کاظمی کی شاعری کو سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار
کی عظمت و بزرگی اس کے سن و سال سے نہیں بلکہ
اس کے فکر و فن سے ہے۔ ان کی شاعری میں دوسروں
کی انگلی پکڑ کر چلنے والی بات نہیں ہے۔"

فیض احمد فیض

ویلکم بُک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی۔ فون: ۲۶۳۸۰۸۶